آسیہ رزاق

عمر بھر کی تلاش ہے

by

ناولٹ

دنیا کی آبادی کس قدر بڑھتی جا رہی ہے۔ افوہ کروڑہا لوگ۔ کسی بھی ہجوم میں مختلف شکل و صورت کے لوگ ہوتے ہیں۔ فلموں میں دوسرے ملکوں کے لوگوں کی شکلیں کتنی عجیب لگتی ہیں۔ اجنبی چہرے مختلف خدوخال۔ اپنے ہی ملک کے کسی بھی شہر کو دیکھ لیجئے بازاروں میں لگتا ہے کہ جلوس گزر رہا ہے۔ جس قدر لوگ گھروں کے باہر ہوتے ہیں اتنے ہی گھر کے اندر بھی۔

زارا کو آبادی کے بڑھتے ہوئے مسئلے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ لوگوں سے گھبراتی تھی۔ افوہ! سب سے ملنا، باتیں کرنا کس قدر مشکل کام تھا۔ لوگ باتیں بھی عجیب عجیب کرتے تھے، سوال بھی قسم قسم کے، وہ جواب دینے میں خاصی اناڑی تھی۔ لوگ اسے بدتمیز بھی کہتے تھے۔ مگر تمیز کس طرح برتی جاتی ہے۔ یہ اسے کسی نے بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے خود سے بڑھ کر کئی بدتمیز گھر میں ہی دریافت کر لیے تھے لیکن کوئی اس کی دریافت کو بدتمیز نہ جانے تو اس کا کیا قصور۔ وہ بھی سب سے یہی سوال کرتی تھی۔

"بھئی، میں بدتمیز ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

کوئی اسے اس کا قصور بھی نہیں بتاتا تھا۔ بس فیصلہ ہو جاتا تھا اور وہ اس فیصلے کے خلاف اشتعال انگیزی کے مظاہرہ کے طور پر تخریب کاری پر اتر آتی۔

جب لاہور جیسے بڑے شہر سے وہ ایک چھوٹے قصبے میں بھیجی گئی تو اسٹیشن پر ہی اسے حیرت نے آ لیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ چھوٹے شہر میں اتنی آبادی ہو سکتی ہے۔ اسٹیشن چھوٹا اور ہجوم بے حد۔ وہ اس ہجوم میں آنکھیں پھاڑے کسی آشنا چہرے شناسا آواز کی منتظر رکی ہوئی کہ آگے جاتے علمی بھیا اسے پکارتے۔ وہ پکتی ہوئی بڑھ جاتی کہ پھر ایک جمگھٹ نظر آتا۔ آدمی ہی آدمی۔ وہ اسے حیرانی سے تکتی کہ پھر علمی بھیا جھلا کر اسے بلاتے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔ مگر کوئی بڑے سے گھیر کے لہنگے میں ملبوس عورت اس کی توجہ اپنی جانب پھیر لیتی تعجب سے اس کا منہ کھل جاتا۔

UrduPhoto.com

کس قدر گھریلو لہنگا اور سوتی ساری چرخ سی عورت کیا مزے سے لہنگا بھرکاتی قدم قدم پر جھنورے والتی اپنے قدموں کے نشانوں میں تیرتی ہوئی سی چلی جارہی ہے۔ اس سے آگے ایک موٹی عورت لگی پٹے دھم دھم زمین کوٹتی چلی آرہی ہے۔ کسی کے ایک ہاتھ میں کتوں کا گچھا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں لکھی کا کنستر اور سر پر کپڑوں کی پوٹلی بھی۔ واہ کیسے مزے دار سین دیکھنے کو مل رہے تھے مگر یہ علمی بھیا اس قدر بدذوق کہ اسے کہیں رکنے ہی نہیں دیتے تھے۔ گلی کے ساتھ ساتھ بھاگے جارہے تھے۔

اس کے بعد تانگے کا سفر شروع ہوا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔ اب وہ ایک اونچے قلعہ نما مکان کے سامنے کھڑے تھے جہاں بڑا سا پھاٹک تھا۔ مگر اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ آنا "فانا" اندر سے نوکر آئے۔ سامان اٹھایا اور غراب سے اندر' وہ قدرے پریشان اور سراسیمہ علی بھیا کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ اندر سے بھی یہ گھر بہت بڑا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ چھوٹے شہر میں مکان بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہوں گے۔ لیکن منی خالہ کا یہ گھر بے حد وسیع تھا۔ باہر کے حصے میں بڑا سا لان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں اور پیچھے کئی کمرے تھے۔ اندر بھی کمروں کی کمی نہ تھی۔ منی خالہ کی وہ صورت آشنا ضرور تھی مگر ان کی عادات سے قطعاً "ناواقف" وہ تو علی بھیا راستے بھر اسے ان کے گھر کے طور طریقے سمجھاتے آئے تھے ورنہ وہ بالکل ہی انجان رہتی۔

ان کے گھر میں پردے کا رواج ہے۔ وہ زمیندار ہیں اور زیادہ فیشن پسند نہیں کرتے۔ مہمانی کرنے زیادہ آزادی کا مظاہرہ نہ کرنا جیسا ہمارے گھر میں کرتی رہی ہو۔" یہ سراسر ان کی زیادتی ہی تھی۔

"خالو بہت تیز مزاج ہیں۔ ان سے ڈرنا۔ ان کی پھوپھی جو اول سے ساتھ رہتی آئی ہیں معترض قسم کی ہیں۔ وغیرہ۔"

وہ سہمی ہوئی علی بھیا کے پیچھے پیچھے اندر آئی۔ تو منی خالہ نے مسکرا کر اسے گلے سے لگایا اور خالو نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ علی بھیا اسے ان لوگوں کے سپرد کر کے خود کسی کمرے میں جا کر سو گئے حالانکہ تمام راستہ وہ اونگھتے اور سوتے ہوئے آئے تھے یا مونگ پھلی کھاتے اور اس کی گود میں ڈالتے۔ منی خالہ کا چہرہ تو اس کا دیکھا ہوا تھا۔ مگر منے خاوند کا اجنبی چہرہ اسے پسند آیا۔ گول گپا۔ بھولا بھولا سا۔ ان کی آنکھیں بھی نرم نرم روشنی سے چمکتی رہتی تھیں۔ ان کے چہرے کرخت نہیں تھے۔

زارا کا ڈر کچھ دور ہوا۔ اندر کے صحن میں دور تک سبزی کاشت کی گئی تھی۔ اس کے باوجود کافی صحن خالی تھا جہاں بیٹھنے کے لیے کرسیاں اور بینچیں رکھی تھیں۔ کنارے کنارے کچھ پھلوں کے پیڑ بھی تھے۔ پھولوں کے پودے بھی۔ زارا کو یہ جگہ پسند آئی۔ اگر وہاں بھی وہ خوشبو نہ تھی۔ جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کی روح جس کی آرزومند تھی۔ اور جو بچپن سے اس کے وجود کو معطر رکھے ہوئے تھی۔ وہ باہر تلاش رہی۔ پھولوں کو سونگھتی اور پھلوں کو تیز نگاہوں سے جانچتی رہی اجنبیت کے باوجود یہ ماحول' یہ فضا دل پر بوجھ نہیں بنی۔ اسے یہاں اپنائیت کا احساس ہوا۔ پھر بھی وہ فوراً "ہی تو بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں کی فضا نہیں تھی۔ وہ ادھر ادھر جاتی تو منی خالہ کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔

"پتا نہیں انہیں میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہے۔ کچھ سوچتی اور الجھتی کاش مجھے علم ہوتا۔"

"اب تم کو کچھ نہیں کرنا ہے۔" علی نے روانگی کے وقت اس سے کہا۔ "اگر کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو مجھے بتا دو۔"

زارا نے گردن نیچی کر کے انکار میں سر ہلایا اور آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو چھپا گئی۔ جب وہ علی بھیا کے گھر سے روانہ ہوئی تھی تو کتنا روئی تھی۔ کیسی کیسی خوشامد اور التجائیں اس نے ماموں کی کی تھیں۔ مگر کسی نے اس کے وعدوں' اس کی منتوں پر توجہ نہ دی۔ نانی اماں کے انتقال کے بعد چھوٹی موبانی نے تو اس سے کلام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بڑی موبانی تو پہلے ہی اس کی دشمن تھیں۔ انہوں نے تو ماموں سے نانی اماں کے انتقال کے دوسرے دن ہی کہہ دیا تھا کہ وہ

زارا کا وجود اب اس گھر میں برداشت نہیں کریں گی۔ اگر وہ یہاں رہی تو وہ خود کہیں چلی جائیں گی۔"

حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ اس بے چاری کا کوئی عزیز ان کے سوا اور ہے ہی نہیں۔ مگر وہ اتنی سنگدل تھیں۔ زارا نے کہا بھی کہ آپ کے ساتھ ایسی واردات گزری ہوتی۔ یا آپ کی اولاد کے ساتھ تو آپ کو احساس ہوتا کہ میں کتنی مجبور ہوں۔ زارا کی عمر چار سال کی تھی جب ماں اور باپ ایک حادثے میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ایک چچا تھے۔ سو وہ ایک تو غریبی کے ہاتھوں مجبور تھے دوسرے ان کی بیوی ایک لڑکے کو چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ وہ زارا کو بہت چاہتے تھے لیکن گھر میں عورت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنے بچے کی پرورش انہوں نے خود کی تھی۔

اس بات پر وہ آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔ ماں باپ کی وفات کے بعد نانی اماں نے اسے اپنے کلیجے سے لگا کر پالا تھا۔ مگر وہ ابھی پورے طور پر پل نہ پائی تھی کہ نانی اماں بیچاری دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کی [illegible] بھی زارا کے والدین کی موت کی طرح زارا کے اعمال میں ڈال دی گئی۔ اب لوگ تابڑ توڑ مرتے رہیں تو اس میں زارا کا کیا قصور مگر وہ کسی طرح یہ بات ہوں ہماری کو نہ سمجھا سکی۔

مرنے سے چند دن پہلے کسی بات پر نانی نے اسے بلا کر اپنا تھا اور کہا تھا۔

"میرے مرنے کے بعد تیرا اس گھر میں گزر نہ ہو تو اس لیے منی کے پاس چلی جانا۔ میں نے اسے لکھ دیا ہے۔"

پھر منی خالہ نانی اماں کے انتقال پر پرسے کے لیے آئی تھیں تو موبانی سے سرگوشیاں کیا کرتی تھیں۔ مگر ان دنوں وہ اپنی پیاری نانی کا سوگ منا رہی تھی۔ ان کے کمرے میں لیٹی رویا کرتی' ان کی ہر چیز سے لپٹ کر تسکین حاصل کرتی۔ نانی کی خوشبو سب سے الگ تھی۔ کچھ کھٹی کھٹی اور کچھ رسیلی سی۔ اسے اچھی لگتی تھی مگر۔ وہ خوشبو جس نے اسے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اور کہیں نہ ملی۔ جب وہ اپنے والدین کے انتقال کے بعد اپنے گھر سے نانی کے گھر لائی گئی تو وہ خوشبو بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔

مانوس سی مہکی اور مدہوش کن وہ اس خوشبو کو ہر طرف تلاش کرتی۔ مگر پھر اسے نہ پایا۔

کہاں کھو گئی تھی وہ مہک؟ جو پل میں اسے خوش کر دیتی تھی ہنسا دیتی تھی اور لمحے بھر میں سلانے کی قوت رکھتی تھی۔

کچھ دنوں وہ اس کی تلاش میں ہر طرف بھٹکی۔ پھر رفتہ رفتہ اس خوشبو کی تلاش اس کا مقصد بن گئی۔ اسے جنون سا ہو گیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا جنون بھی بڑھ گیا۔ ناکامی پر وہ سب کو اذیت پہنچانے لگتی۔ کسی کے کپڑے دانتوں سے پھاڑ دیے تو کسی کے زیور کھینچنے لگی۔ شاخ سے پھول توڑ ڈالے یا بے مقصد بک بک کرنے لگی۔ پھر کچھ ہوش سنبھالنے پر اسے نانی کی خوشبو اچھی لگنے لگی۔ مگر نانی اماں کے مرتے ہی جب اسے منی خالہ کے گھر بھیجے جانے کے تذکرے ہونے لگے تو وہ گھبرا گئی۔ ماموں نے دھیمے انداز میں اسے بتایا۔

"اب چونکہ تمہاری نانی دنیا میں نہیں رہیں اس لیے تم منی کے گھر چلی جاؤ۔"

یہ سن کر وہ بے حد برہم ہوئی۔ "نانی دنیا میں نہیں رہیں تو کیا آپ بھی دنیا میں نہیں رہے؟ موبانی بھی مر گئیں؟ باقی سارے لوگ مر گئے؟"

موبانی دانت پیس کر بولیں "دیکھ لینا' سب کو کھا کر جائے گی یہ۔ ایسی منحوس ہے۔ زبان کی کالی۔"

وہ موبانی کے غصے سے ڈر گئی۔ حالانکہ وہ تو ان کی بہت خدمت کرنے لگی تھی۔ نانی اماں کہتی تھیں۔

"بیٹی! خدمت میں عظمت ہے۔ تو ان لوگوں کی خدمت کر کے ان کے دلوں میں گھر بنا لے۔ نہیں تو یہ زندہ نہ چھوڑیں گے تجھے۔ بڑے مطلب پرست لوگ ہیں۔"

اور وہ ان کے کہنے پر جب بھی موبانی کی خدمت کرنا چاہتی اسے منع کر دیا جاتا' ڈانٹا جاتا۔

"اندھی ہو' یہ کون سا وقت ہے جھاڑو دینے کا سامنے بڑیاں سوکھ رہی ہیں۔ ساری گرد میں اٹ

Urdu Phone.com

گئیں "کھانے کے لائق نہیں رہیں۔" وہ خدمت کے شوق میں شال دھو دیتی تو ممانی چلاتیں۔

"ارے غضب کیا میری شال کس نے صابن سے دھو کر رکھ دی۔ سارے رنگ خراب ہو گئے میں نے تو ڈرائی کلیننگ کے لیے نکالی تھی۔ خدا غارت کرے زارا تجھے۔"

یا پھر وہ ان کے کھلے بالوں میں کنگھا کرنے کو کھڑی ہوتی تو۔

"اوئی یہ میرے سر پر کیوں سوار ہو گئیں۔ بال ہی کتنے رہ گئے ہیں کہ وہ بھی کھسوٹنے کو آ گئیں۔"

ممانی اسے ایسی غضبناک نظروں سے گھورتیں کہ وہ ہول کر پرے ہٹ جاتی۔

"جوتھا ہی لوتھا ہو گئی۔ عقل نام کو نہیں۔ سب کے سامنے ذلیل کر دیتی ہے۔ اس دن شوکت بھائی سے بولی کہ اس گھر میں سب آپ کی برائی کرتے ہیں۔ بھئی میں نے تو جو سچ بات تھی وہ بتا دی تھی اس کے سامنے تو بات کرنا ستم ہے۔"

"ہاں اور اس دن رحیم الدین صاحب سے کہنے لگی کہ جب آپ سیمن سے بات کرتے ہیں تو دیکھتے نہیں کی طرف ہیں اور مجھ سے بات کرتے ہیں تو سیمن کو دیکھتے ہیں آپ کو جس سے بات کرنا ہے اسی کو دیکھیں۔"

"اور سکندر کو تو شرمندہ کر کے رکھ دیا (رحیم الدین بے چارے بھینگے تھے اور سکندر ہکلا) بولی کہ سکندر! آپ سوچ کر بولا کریں تاکہ بات جلد ختم ہو۔ کمبخت کی زبان جی چاہتا ہے کاٹ دوں۔"

ممانیاں جیسی بھی تھیں اجنبی نہیں تھیں، اور یہ منی خالہ تو جانے کیسی ہوں گی وہ سوچ سوچ کر ہولتی رہی۔ مگر اس کی ساری خوشامد منت، وعدے قسمیں ضائع گئیں۔ ممانیوں نے الٹا سیدھا سامان بکس میں ٹھونسا اور اسے علی کے ساتھ چلتا کیا۔ علی نے منی خالہ کے گھر سے اپنے ہاں جاتے وقت پوچھا۔

"ہاں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو اور دیکھو ٹھیک سے رہنا۔ بدتمیزی نہ کرنا۔ اس گھر کے بعد اب اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے تمہارا۔ ایک وہ لے دے کے چچا ہیں تمہارے۔ مگر ان کے گھر میں فاقوں کے سوا اور بھی کچھ ملے گا۔ اس کا مجھے یقین نہیں یہاں کھانے پینے کی آزادی ہے اور منی پھپھو کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ہے نا مزہ۔ بس اب یہاں سے کسی شکایت کی خبر وہاں نہ پہنچے سمجھیں۔ وہاں کوئی بھی تمہارا چاہنے والا نہیں ہے۔"

زارا کے آنسو آنکھوں کے کناروں پر ٹھہر گئے تو علی چلے گئے۔

جتنے آنسو ماموں کے سامنے وہ بہا چکی تھی ان ہی کی کسی نے قدر نہیں کی تو اب علی کے سامنے تو آنسوؤں کا مظاہرہ بیکار تھا۔ وہ شے بھی مجبور دراصل انہی کی ہمدردی سے ڈر کر ممانی نے اور بھی زارا کو جلدی کر کے روانہ کر دیا تھا کہ کہیں علی کی زبان بھی اس کی ہمدردی میں کھل گئی تو وہ جوان بیٹے کی اطاعت سے ہی محروم نہ ہو جائیں۔

منی خالہ بہت منتظم خاتون تھیں۔ ان کی زمینیں تھیں اور ان کا حساب کتاب بھی وہی کرتی تھیں۔ خالو تو گھر میں بیٹھے ہارمونیم بجایا کرتے غزلیں گاتے۔ نوکروں پر خفا ہوتے یا کوٹھے پر جا کر اپنے کبوتروں کی دیکھ بھال کرتے، دوپہر کو کھانا کھا کر سوتے تو مغرب کی خبر لاتے۔ جھینگر ان کو غافل پا کر بیٹھے بیٹھے خود بھی نیند کے مزے لیتا رہتا۔ جھینگر کبوتروں کا کابک اور دوسری صفائی بھی کرتا اور خالو سے اسے خاصی مار کھانے کو ملتی۔ مگر وہ مگن تھا۔

منی خالہ کے علاوہ اس گھر میں ایک عورت تو خالو کی پھپھو تھیں۔ "بزرگ صورت" کائیاں عورت" زارا نے دل میں ان کو خطاب دیا۔ یہ پھوپھو جو پھوا کہلاتی تھیں۔ بہت رنگین مزاج اور کھانے پینے کی شائق تھیں۔ ان کے سرہانے اکثر مٹھائی رکھی رہتی جو زیادہ تر چیونٹیوں کا چارہ بنتی۔ ان کے اپنے حصے میں بھر بھرا کھویا آتا۔ وہ چیونٹیوں کو جھاڑ جھاڑ کر برا بھلا کہتی ہوئی کھاتی جاتیں اور منی خالہ سے مزید مٹھائی کا تقاضا بھی کرتی رہتیں۔

دوسری عورت بوا تھیں۔ انہوں نے کبھی خالو کی ملازمت کی تھی اب مفت میں رہ رہی تھیں۔ پلنگ پر

ٹھڑیاں پوٹلیاں پھیلائے ہر وقت کچھ سیتی رہتیں۔ زارا نے ان سے کہا۔

"بوا! مجھے ایک گڑیا بنا دیں گی آپ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

بوا نے انکسارانہ چاپلوسی سے کہا اور پوٹلیاں ٹٹولنے لگیں۔ دو گھنٹے کے حیران کن انتظار کے بعد بھی انہیں گڑیا کے لیے مناسب کپڑا دستیاب نہ ہو سکا۔ ایک کپڑا نکالتیں ہاتھوں سے سلوٹیں درست کرتیں۔ پیمائش کرتیں پھر رکھ دیتیں۔ دوسرا کپڑا نکالا جاتا جب زارا کو امید بندھتی کہ اب مسئلہ حل ہو گیا تو کپڑا بھی رد کر دیا جاتا۔

تنگ آ کر زارا دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ جہاں بزرگ صورت کائیاں پھوا اس سے سوالات کر کے عاجز کر دیتیں۔ ہر دفعہ ملنے پر وہ پوچھتیں کہ زارا کس مقصد سے آئی ہے؟ کب تک رہے گی؟ سوالات کر کے وہ اونگھنے لگتیں یا سو جاتیں۔ جاگ کر پھر سوالات شروع۔

"ہاں بتایا تھیں تم نے، تمہارے اماں باوا کہاں ہیں؟"

"میں نے بتا دیا تھا۔"

"میں نے نہیں سنا تھا۔ پھر سے بتاؤ۔" وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھیں کہ وہ کچھ بھول بھی سکتی ہیں۔ انہیں اپنے حافظے پر بڑا غرور تھا۔

"کیا کریں گی پوچھ کر؟"

"ایسے ہی معلوم ہونا چاہیے۔"

"ملنا چاہتی ہیں ان سے؟"

"ہاں مل لوں گی۔"

"واقعی ملنا چاہتی ہیں تو بتائیے۔"

"ہاں ملوں گی۔ کیا آنے والے ہیں وہ لوگ بھی؟"

"نہیں تو آپ چلی جائیں ان سے ملنے۔" اس نے جل کر کہا۔ ان سے بیزار ہو کر باہر نکلی تو منے خالو کتے سے کھیل رہے تھے۔

"منے خالو! کتا گندا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"جن کتوں کو صاف رکھا جائے وہ گندے کیسے ہوں گے۔"

"یہ تو اولی گندے ہوتے ہیں۔ سنا ہے۔"
"جو انسان سے پیار کرو وفادار ہو۔ وہ بہت اعلا درجے کا ہوتا ہے۔"
"اس کتے کا نام کیا ہے؟"
"اس۔ اتنا بڑا لمبا سا نام ہے یاشجر۔"
"بھئی انسانوں کے بھی تو لمبے نام ہوتے ہیں جیسے حکیم اختر، شکستہ جان، محمد خان یا بہادر افروز بہادراں۔ سکندر بخت، روپیہ خان، دولت بہادر قلندر بخت یا پھر اجبک خان قربان زمان۔"
زارا کو ہنسی آگئی۔ خالو دلچسپ آدمی تھے۔ علی نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ انہوں نے اپنے نوکروں کے عجیب قسم کے نام رکھ چھوڑے تھے۔ مکوڑا، کانولا، سپٹ، کھسیٹا، بیرہوئی اور جھینگر تو تھا ہی۔
مکوڑا بھینسوں کا ملازم تھا۔ جب پہلے پہل زارا نے بھینس کا دودھ پیا تو اسے ابکائی آگئی۔
"پی لو۔" مٹی خالہ نے کہا۔ "اس سے تمہارے رنگ میں سفیدی آجائے گی۔ ایک دم پیلی رنگت ہے۔ خون دوڑنے لگے گا۔"
وہ سفید ہونے کی آس میں گلاس دودھ چڑھا جاتی اور بڑے ارمان سے آئینہ دیکھا کرتی۔ مایوسی نے اس کی آنکھوں میں رنگ جما لیا تو اس نے یہ نسخہ مسترد کر دیا۔
"نہ سفید نہ کالی میں تو خاصی موٹی ہو گئی ہوں۔ سب کپڑے تنگ ہو گئے۔" اس نے کہا۔
مٹی خالہ نے اس کے دس جوڑے بالکل نئے بنا دیے۔
اور پھر اسے کانولا کے سپرد کر دیا گیا کہ زارا کو دعوتی کھانے پکانا سکھا دے۔ کانولا بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس نے اسے اپنا اسسٹنٹ بنا لیا اور کے سارے کام لیتا۔ گھر کی جھڑکی الگ۔ کھانا پکانا تو اسے کیا آتا۔ سل پر مسالہ پیس پیس کر ہتھیلیاں سخت ہو گئیں اور ان میں گٹے پڑ گئے اور سخت درد ہونے لگا۔ منے خالو جھینگر سے اپنے بازوؤں پر تیل مالش کرا رہے تھے۔
زارا نے ان سے پوچھا۔ "منے خالو! کیا اس تیل سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے؟" اور ہتھیلی ان کے سامنے

کر دی۔
خالو نے اس کی بات سن کر ایک منٹ بھی انتظار نہ کیا اور چٹکھارنے لگے۔ "کانولا! کانولا؟" جوں ہی وہ بھاگتا ہوا آیا انہوں نے پاس رکھی بید کی چھڑی سے اس کی خاصی سرمت کروائی۔
مٹی خالہ نے کہا۔ "چلو، میں خود تمہیں پکانا سکھاؤں گی۔ کوئی ہنر ہاتھ میں ہو تو خود پر بڑا اعتماد رہتا ہے۔"
وہ اسے شامی کباب بنانا سکھا رہی تھیں۔ سب کچھ تیار کروا کے وہ پھوا کی کسی بات کا جواب دینے ان کے کمرے میں گئیں تو زارا اکتا کر باہر آگئی۔ اور کبابوں کے لیے خالہ کی ہدایت کے مطابق ہرا دھنیا کاٹنے لگی کہ اس دوران بلی اندر جا کر سارا قیمہ چٹ کر گئی۔
خالہ نے پوچھا۔
"دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دیا تھا تم نے؟"
"بھول گئی۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔
"دیکھو بیٹی! جیسا دیکھتی ہو ویسا ہی کیا کرو۔ پہلے کبھی تم نے باورچی خانے کا دروازہ کھلا نہ دیکھا ہو گا۔"
"دیکھا تھا۔"
"بھلا کب؟"
"اب جب میں باہر آئی، دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔"
"اب اس دھنیے کا کیا ہو گا؟" وہ جھلا کر اتنا ہی کہہ سکیں۔
"چٹنی پیس لوں گی۔"
"کانولا! کانولا! چلو گوشت، کھارد اور پالک کی بھجیا بنا لو۔"
"میں کباب کھاؤں گی۔" پھوا نے اندر سے ہی پکار کر کہا۔
"اچھا تو یہ بچا کھچا قیمہ تل کر پھوا کو دے آؤ۔" وہ جل کر بولیں۔
"دیکھو بیٹی!" انہوں نے ایک دن اسے پاس بٹھا کر سمجھانا شروع کیا۔ "تمہاری ماں میری بے حد عزیز بہن اور سہیلی تھیں۔ وہ میری سگی خالہ زاد ہی نہیں دودھ شریک بہن تھیں۔ اس رشتے سے تم میری بیٹی ہو۔ تم کبھی یہ نہ سوچنا کہ تمہاری ماں مر گئی ہیں، میں تمہاری ماں ہوں۔ جب بھی تمہیں شکایت ہو۔ یا کوئی تکلیف ہو مجھ سے کہنا۔"
وہ سر ہلاتی رہی۔ مگر ابھی اس نے مٹی خالہ کا چہرہ اور ظاہری برتاؤ ہی دیکھا تھا۔ ان کے دل میں کیا ہے اس کی خبر ہونے تک وہ ان سے کچھ بھی کہنا نہ چاہتی تھی۔ پتا نہیں وہ اسے کیسا سمجھتی ہیں؟ ماموں سوہانی نے ان کو اس کے بارے میں کتنا بتایا ہے؟ اور وہ اسے سوہانی کی طرح منحوس اور قاتلہ سمجھتی ہیں۔ یا بے خطا، بے قصور، ہو سکتا ہے وہ ابھی اسے آزما رہی ہوں۔ اپنی بے حد عزیز از جان بہن کی بیٹی کو خود سے بدظن کر کے اس پر قابو پانا چاہتی ہوں۔ جیسے چھوٹی ماموں نے اس کے ساتھ رویہ رکھا تھا۔ اس سے خوب گھل مل کر باتیں بناتیں اور نانی اماں کے پاندان سے سروٹ چھالیہ اور پان منگوایا کرتیں اور بعد میں تو پاندان میں رکھے پیسے بھی اس سے چھپا کے اٹھوا لیتیں۔ نانی اماں کے بار بار پوچھنے پر اس نے کبھی اعتراف نہ کیا کہ چھوٹی موہانی اسے بہت عزیز تھیں۔ ڈانٹتی تھیں اعتراض بھی نہیں کرتی تھیں اور چھوٹے ماموں بھی اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے لیے چائے بنا کر پلاتی اور انعام میں بیس کریم کھاتی۔ مگر نانی اماں کے انتقال کے فوراً بعد چھوٹی موہانی نے آخری بار اس سے کام لیا اور نانی اماں کے بکس سے وہ گنگا جمنی عود دان نکلوا لیا۔ جو وہ زاہدہ کے لیے وصیت کر گئی تھیں۔ اس کے بعد اسے گھر سے نکلوانے میں چھوٹی موہانی نے خوب کردار ادا کیا جانے کیا کہہ کر چھوٹے ماموں کو بھی بدظن کر دیا۔ اب اسے کوئی شکوہ نہ تھا۔
یوں بھی ان کی زیادتی کا انتقام اس نے کسی طرح لے ہی لیا تھا اور جب وہ نہانے گئی ہوئی تھیں۔ اس نے چوہے دان میں قید چھوٹے سے چوہے کو معہ رسی کے ٹکڑے کے ان کے جہیز کے قیمتی کپڑوں کے بکس میں ڈال کر بکس بند کر دیا۔ اس کے آنے کے بعد انہیں پتا چلا ہو گا۔ انہیں اپنے جہیز کے کپڑے بہت عزیز تھے۔ کبھی زارا کو بھی پہننے کو نہیں دیتی تھیں کہ خراب ہو جائیں گے۔ کنجوس مکھی چوس، غصے میں اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔
"میں ہیں! یہ کیا کر رہی ہو؟ کینو کو کاٹ کر اس کا جوس نکالا کرو بیٹی۔"
مٹی خالہ جانے کب سے اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کینو کا رس تو نہیں نکال رہی تھی۔ وہ تو یونہی چھوٹی موہانی پر غصہ آرہا تھا تو ہاتھ میں تھامے کینو پر نکل گیا۔ ذرا اندر سے مٹھی بھینچ گئی ہو گی۔
مٹی خالہ نے اسے کئی لوگوں سے ملوایا۔ کئی لڑکیاں زارا کی ہم عمر تھیں۔ وہ ان سے ملی مگر مٹی خالہ کے بہت کہنے پر بھی ان کے گھر جانے کا دل نہ چاہا۔ یہ اجنبی لوگ۔ کیسے ان سے مل کر خوش ہو گی۔ نانی اماں کے گھر میں تو موہانی کو جلانے کے لیے وہ اسکول سے کسی نہ کسی لڑکی کو ساتھ لے آتی تھی۔ یا کبھی راہ چلتی لڑکی کو پکڑ لاتی۔ یہ میری سہیلی ہیں۔ انہیں خوب کھلاتی پلاتی۔ موہانی دانت پیس کر رہ جاتیں۔ ایک دن اسکول سے آتے ہوئے اس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ تو وہ سڑک پر بیٹھ کر نکالنے لگی اور رونے لگی۔ تو ایک راہ گیر نے اسے اپنی سائیکل پر بٹھا کر گھر لا کر چھوڑ دیا۔ وہ اسے اندر نانی اماں کے پاس لے آئی۔ موہانی نے دیکھا تو اسے الگ لے جا کر پوچھا۔
"یہ کون ہیں؟" ان کا خیال تھا کوئی استاد ہیں جو تحریری شکایت نامے کے بعد اب زبانی اس کی رپورٹ کرنے آئے ہیں۔
"یہ؟" وہ کچھ سٹپٹا گئی۔ "یہ انکل ہیں میرے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔
موہانی نے اس کا بازو مروڑ دیا۔
"فتنی! جانے کس کس کو گھر میں گھسا لاتی ہے۔ تیرے باپ کی جاگیر ہے کیا؟"
ہاتھ مروڑنے کی تکلیف ہی کم نہ تھی مگر الفاظ نے تو اسے شعلوں میں نہلا دیا۔ کانپنے لگی بولی۔
"میرے باپ کی نہیں تو آپ کے باپ کی بھی نہیں ہے۔ آپ کے رشتے دار کیوں دندناتے پھرتے ہیں یہاں؟ میں نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔" وہ کہہ کر انہیں دم بخود چھوڑ کر بھاگ آئی۔ اس نے انہیں شربت بھی پلایا اور پھر کبھی آنے کا وعدہ بھی لیا۔ نانی

UrduPhoto.com
Posted by Mina@oneurdu.com

اماں نے ان صاحب کا شکریہ ادا کیا جو ان کی نواسی کو گھر پہنچانے آئے اور کالیا بھی نکالا۔ وہ حیران سی دیکھ رہی تھیں کہ ان کی اکھل کھری نواسی جو کبھی کسی رشتے دار سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ نہ صرف اس اجنبی سے باتیں گھما رہی ہے بلکہ ان کی خاطر مدارات میں پیش پیش ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"پھر آپ آئیں گے تو میں آلو بخارے کا شربت پلاؤں گی۔ آپ کو مزے دار۔" وہ جانے کو اٹھے تو نانی اماں نے ان کا نام پوچھ لیا۔

"جی مجھے بنجمن کہتے ہیں۔ آر تھر بنجمن۔" نانی اماں کا چہرہ فق ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی ایک دھمو کا بے خبر زارا کی پیٹھ پر پڑا تھا۔

"آلو بخارے کا شربت پلاؤں گی۔" نانی کچکچا کر دوسرا تھپڑ مارنے کو ہوئیں تو وہ دور کھسک گئی نانی اماں نے غصے سے کہا۔

"میرے برتن گندے ہو گئے۔ چل پاک کر کے لا۔"

"اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے نانی اماں اور پھر وہ تو اہل کتاب ہیں۔" اس نے کہا۔

"تقریر کروالو۔" نانی اماں نے ایک اور دھمو کا رسید کیا۔ مگر رات کو جب ماموں من تمن کرتے اس کی شکایت کو آئے تو وہ بگڑ گئیں۔

"تو اور سنو اب ایسی تنی گزری بھی نہیں وہ اگر اس نے احسان مندی کے احساس سے ایک شریف آدمی کو بلا کر شربت پلا دیا تو کون سی کمی ہو گئی تمہارے گھر کے بجٹ میں۔ وہ سڑک پر کانٹا چبھوئے پڑی رہتی چاہے کسی کار تلے آجاتی۔ تم خوش ہو جاتے ایک بھلا آدمی اسے گھر لے آیا تو قاتل گردن زدنی ہو گیا۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" ماموں کے پیچھے موماتی کھڑی برابر بڑبڑا رہی تھیں۔

ماموں نے پھر کہا۔

"اماں! مگر وہ تو ایک بالکل غیر آدمی تھا اسے گھر کے اندر بلانا۔ کس طرح مناسب تھا۔"

نانی اماں کمر موڑ کر بے نیازی سے بولیں۔ "بھئی مجھے کیا خبر کیا مناسب ہے یا نہیں۔ میں تمہارے گھر کے طریقے کیا جانوں۔"

"اماں! کمال ہے۔ جوان لڑکیوں کا گھر ہے۔" وہ پھر منمنائے۔

"اے تو بیوی سے بھی کہا ہے کہ یہ جو روزانہ جوان سنڈے مسنڈے گھر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کھاتے ہیں، لفنگوں کی طرح گاتے بجاتے ہیں۔ تو ان پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ بھوکے جاتے کب کے آتے ہیں کھانے کو۔ آنکھوں میں مروت نہ حیا تہذیب سے واسطہ نہ تعلق کرن ہیں اونہہ۔"

"خیر آپ زارا کو بتا دیجئے آئندہ ایسا نہ کرے سمجھا دیجئے۔"

"میں تو تمہیں آج تک نہ سمجھا سکی بیٹا تم تو میری اولاد ہو تم نے کس دن میری اطاعت کی جو اس پرائی اولاد سے توقع کروں میں۔"

نانی اماں موذن شکن جواب دینے میں ماہر تھیں۔ دراصل ماموں نانی اماں کی مرضی کے خلاف اپنی خوشی سے شادی کر کے لائے تھے۔ موماتی کو شکوہ تھا کہ وہ گھر کی بڑی بہو ہیں مگر کوئی بھی قدر دان نہیں۔

"قدر ہم اس کی کرتے ہیں جسے منت مراد سے خود بیاہ کر لاتے ہیں بارات کے ساتھ۔" نانی اماں انہیں جواب دیتیں۔ "تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کس کھیت کی مولی ہو۔ جب ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں تو جانتے بھی نہیں۔ پھر شکوہ کیسا بیٹے نے کہا کہ یہ بہو ہے ہم نے کہا ہو گی۔ شکر کرو گھر میں رہتی ہو حکومت کرتی ہو۔"

نانی اماں غصے میں ننگی تلوار ہو جاتی تھیں۔ موماتی نے ساس کی اپنے اوپر روا زیادتیوں کا بدلہ ان کی لاڈلی نواسی کو گھر سے نکال کر اور زارا کے لیے رکھے قیمتی زیوروں ——— پر قبضہ کر کے لیا اور اب ٹھاٹھ کرتی ہوں گی۔ وہ سوچتیں۔

منی خالہ کی ایک سسرالی عزیز کچھ دور پر رہتی تھیں۔ ان کی بیٹی فرحت زارا کو پسند آئی۔ سیدھی سی تھی۔ اس کی ماں بھی نیک اور سیدھی تھی۔ زارا ان کے گھر گئی تو وہ اس سے منگنی اور کم آمدنی کے دکھڑے رونے لگیں۔

"یتیمی کا ساگ۔ کوئی نکے کو نہیں پوچھتا تھا۔ آج جو میں نے منگایا تو ایک روپے کا ملا۔ ہر چیز میں آگ لگی ہے۔ کوئی کیا کھائے، سبزی اتنی مہنگی دالیں مہنگی۔ گوشت آسمان پر۔"

زارا آسمان دیکھنے لگی۔ پھر جھینپ کر بولی۔

"سبزی۔ ارے سبزی کا کیا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سبزی لگی ہے۔ جب ضرورت ہو منگوا لیا کریں۔"

فرحت کی ماں اس کی بلائیں لینے لگیں۔ زارا کو عجیب سی خوشی ہوئی۔ بلائیں لینا تو درکنار نانی کے ہاں تو اپنی بلائیں اس کے سر ڈالنے کی فکر میں غلطاں رہتی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

خالو نے زارا کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ گھبرائی بہت مگر لڑکیوں پر اس کا رعب بہت تھا۔ وہ زمیندار کی رشتے دار ہے۔ یہ تعلق بہت کام کا ثابت ہوا۔ استانیاں بھی اس سے خصوصی سلوک روا رکھتیں۔ وہ استانیوں کی مداح ہو گئی اور ان کے کہنے سے خوب دل لگا کر پڑھائی کرنے لگی۔ کبھی کبھی منی خالہ بھی سوچتیں۔ اس کے ماموں نے تو غلط میں اور نانی زارا کی بد شگونی سے بیزاری اور کندھنی کا اس قدر ذکر کیا تھا مگر وہ تو اس کے برعکس نظر آتی تھی۔ ایک دن زارا اسکول سے آئی تو منی خالہ کچھ پریشان بیٹھی تھیں۔

"یہ مس برنی سے تم نے کچھ کہا تھا۔ سبزی کے بارے میں؟"

"میں نے؟" زارا کا دل دھڑکا۔ اب منی خالہ اسے ڈانٹیں گی مار دیں گی۔ گھر سے نکالیں گی اور پھر چچا آپا کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں جہاں صرف فاقے ملیں گے۔

"ہاں چپراسی آیا تھا اسکول کا۔ کہہ رہا تھا مس برنی نے سبزی منگائی ہے۔ فرحت کی ماں عروج کی بھابھی اور سلمیٰ کی خالہ بھی تمہارا نام لے کر ڈھیروں سبزی لے گئیں۔ میں سمجھ گئی کہ تم نے ان سے ذکر کیا ہو گا۔"

"جی منی خالہ۔" وہ جلدی سے بولی۔ "بات یہ ہے کہ ہر چیز اس قدر مہنگی اور لوگ اس قدر بے ایمانی سے کام لیتے ہیں کہ بلاوجہ ہر چیز کی قیمت بڑھا دیتے ہیں اور تولتے بھی کم ہیں۔ سبزی تو بیکار سی چیز ہے مگر اسے بھی اس قدر منگا کر دیا کہ غریب لوگ کس طرح خرید سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو مفت کی سبزی ہے نا۔ میں تو کھائی بھی نہیں۔ اس لیے میں نے سب سے کہہ دیا کہ آکر لے جایا کریں کیوں؟ برا کیا میں نے؟" وہ سہمی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ان سے جواب نہ بن پڑا۔ بے چارگی سے اسے دیکھتی رہیں۔

"یہ تم مجھے ہمیشہ منی خالہ کیوں کہتی ہو؟" انہوں نے بات بدلی۔

"وہاں سب آپ کو منی کہتے تھے۔ میں بھی کہنے لگی۔"

"سب کون؟"

"نانی اماں اور بڑے ماموں۔"

"تو وہ تو کہیں گے ہی۔ مگر تم مجھے خالہ امی کہا کرو۔ سمجھیں اور یہ منے خالو کی کیا تک ہے۔ خالو جان کہہ لیا کرو۔" زارا نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔

"آپ نے چپراسی کو سبزی دے دی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں دے دی مگر آئندہ نہیں دوں گی۔ یہ سبزی میں نے گھر کی ضرورت کے لیے لگوائی ہے یا بانٹنے کے لیے؟ مالی کام کرتا ہے اسے تنخواہ دی جاتی ہے۔"

زارا دل میں انہیں کنجوس کا خطاب دے کر افسردہ ہو گئی۔ پھوا نے الگ اسے سوالات سے عاجز کر مارا تھا۔

"کب جاؤ گی؟ کب تک رہو گی؟"

✈ ✈ ✈ ✈

میٹرک کے امتحان کے بعد دن خالی گزرنے لگے تو پھوا اسے اپنے پاس بٹھا کر گزری جوانی کی داستانیں سنانے لگیں۔ ان کے گلے میں جڑاؤ نیکلس، کانوں میں کرن پھول، ہاتھوں میں کنگن ہمیشہ جگمگاتے۔ پھولوں کے گہنے بھی خوب شوق سے پہنتیں۔

"پھوا۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"انہوں نے کرنے نہیں دی۔" وہ خالو کی طرف

Urdu Photo.com

اشارا کرتیں۔ "جس سے میں چاہتی تھی وہ غریب تھا۔ ان کی ناک کٹنے لگی کہ ہیں یہ کیا؟ کسان سے زمیندار کی۔ کن کیسے یاری جائے؟"

"وہ کیسا تھا؟"

"بہت اچھا انسان تھا۔ سب غریب لوگ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایک انسان تھا۔ انسان جس کی ہم لوگوں میں کوئی قدر نہیں ہوتی۔"

انہیں چند مٹ پہلے کی بات یاد نہ رہتی مگر برسوں پرانی باتیں خوب یاد تھیں۔ اب تو انہیں محض کھانے پینے کا شوق تھا۔ زارا بڑے سے کمرے میں وقت گزاری کے لیے کتابیں پڑھتی اور کھڑکی سے باہر کے لان میں لگے پھولوں کو تکا کرتی اندر باہر موسم کے ہر رنگ کے پھول تھے۔ مگر وہ خوشبو جو زارا کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ کہیں نہ تھی۔ وہ کبھی بے چین ہو جاتی۔ جب دل پر کوئی دھکا لگتا یا بیمار ہوتی اس نشاط انگیز خوشبو کی تلاش میں تڑپتی رہتی۔ کبھی کبھی اسے اتنے بڑے اس قدر سازو سامان سے سجے ہوئے گھر سے وحشت ہونے لگتی۔ منی خالہ کا مربیانہ سلوک، خالو کی مزاحیہ باتیں بھی اس کے دل کی ویرانی کو آباد نہ کر پاتیں۔ اس کے اندر ایک خلا تھا۔ جس کے پر ہونے کی کوئی راہ نہ تھی' اسے خود علم نہ تھا۔ یہ خلا کب اور کیسے پر ہو گیا؟ مگر بہت بیزار ہو کر بھی وہ کوئی ایسا کام کرنا نہ چاہتی تھی کہ خالہ اسے گھر سے نکال دیں۔ پھر وہ کہاں جائے گی۔ ایک چچا ہیں مگر وہ برسوں میں شکل دکھاتے ہیں۔ وہ ان سے دور دور رہ کر سلام کر کے ناکا بھاگی کیا کرتی پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان میں کشش ضرور تھی۔ جانے کیا وہ سمجھ نہ سکتی۔ مگر ان کے گھر جانے کا مطلب تھا۔ فاقے کرنا اور اسے بھوک کی برداشت نہ تھی۔ جانے وہ لوگ جن کے عزیز رشتے دار نہیں ہوتے۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ کس جگہ رہتے ہیں اور کیسے؟ کوئی اسے نہ بتاتا۔ اس لیے صبر سے بیٹھی رہی۔

رات کو آندھی کے شور سے آنکھ کھل جاتی' پتے سراتے اڑتے پھرتے۔ درخت سے کوئی شاخ ٹوٹ کر آواز پیدا کرتی ہوئی نیچے آگرتی۔ وہ ڈر جاتی اور رو دیتی۔ تنہائی اور آوازوں کا خوف ایسے میں کسی مانوس خوشبو کا معطر جھونکا قریب سے گزرتا اور اسے نیند کی وادی میں لے جاتا۔ دن بھی سناٹے میں گزرتے۔ خالہ امی مصروف رہتیں۔ نوکر بھی دبی زبان سے باتیں کرتے۔ ان کے قدموں کی آہٹیں تیز جھگڑوں میں گم ہو جاتیں۔ عجب قسم کی اداسی سارے ماحول کو شکنجے میں کسنے لگتی۔

"آموں کی فصل خراب ہو گئی۔ یہ آندھیاں کچھ نہیں چھوڑیں گی۔" خالہ امی متانت سے کہتیں۔ پھوا دل پر ہاتھ رکھ کر آموں کے ڈالیے یاد کرنے لگتیں۔ ایسے ہی موسم میں لندن سے توفیق آگیا۔ خالہ امی کا بیٹا۔ زارا اسے مل کر بہت خوش ہوا۔ پھوا سے دیر تک لندن کے کھانوں اور نقلی زیورات کی باتیں کرتا رہا۔ پھر چاکلیٹ کا پیکٹ ان کے سرہانے رکھ کر بولا۔

"کھا لیجیے گا پھوا! چیونٹیوں کو نہ کھلائیے گا۔ یہ آپ کا پڑوس خاصا خطرناک ہے۔"

زارا کو توفیق کی حرکات اور چہرے کے تاثرات میں بیزاری کی معلوم ہوئی۔ وہ کمرہ بند کر کے بیٹھی رہتی اور مستقبل کے منصوبے بناتی رہتی۔ کس کس سے انتقام لینا ہے؟ اور کس طریقے سے لینا ہے۔ خالہ اس کی آدھم بیزاری سے خائف تھیں۔ وہ اسے کسی نہ کسی بہانے روکے رکھتیں۔ اسے سلائی سکھانے کے لیے ہر طریقہ آزما چکی تھیں انہوں نے کہا۔

"ہم کٹنگ سیکھ لو۔ یہ بھی کام آنے والا ہنر ہے۔"

اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "خالہ امی! کیا آپ واقعی مجھے درزن بنانا چاہتی ہیں؟"

خالو اس کو اپنے پاس بٹھا کر اخبار سنا کرتے۔ پھوا اسے اپنی گزری جوانی کے قصے سنایا کرتیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ اس کا رزلٹ آگیا' وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ خالہ امی نے اس کے ماموں کو بھی خط کے ذریعے یہ اطلاع بھیج دی۔ پھر خالو نے اسے کالج میں داخل کرا دیا۔

"یہاں دو کلاسیں پڑھ کر شہر میں بڑے کالج میں داخلہ کروا دوں گا۔" خالو نے اسے بتایا۔ پھر ہوسٹل میں ٹھاٹھ سے رہنا۔" وہ خوفزدہ ہو گئی۔ نئی جگہ لوگ وہ کس طرح سب کے ساتھ رہ سکے گی ہوسٹل میں۔

"میں اور نہیں پڑھوں گی۔" اس نے خالو سے کہا۔ "فائدہ ہی کیا ہے؟"

"جب پڑھ کر فارغ ہو گی تو پتا چلے گا۔ ارے پگلی شعور جاگتا ہے۔ علم سے عقل روشن ہوتی ہے۔ یہ جو تمہی کبوتری کی طرح کونے کھدروں میں گھسی رہتی ہو۔ یہ کم علمی کا نتیجہ ہے۔ لوگوں میں بیٹھو بولو کھیلو' پھر دیکھنا لقا کبوتر کی طرح ناچنے کو جی چاہے گا۔ خود بخود سینہ تان کر چلو گی غرور سے۔"

"غرور بہت بری چیز ہے۔ مجھے پسند نہیں۔" وہ بزرگانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"اچھا غرور نہ سہی۔ فخر سہی اب تو راضی" وہ اسے اپنے پاس بٹھا کر فزکس کیمسٹری پڑھاتے۔

"میری بیٹی ڈاکٹر بنے گی۔" وہ سینہ پھلا کر کہتے۔

"سب سے پہلے میرے کبوتروں کا علاج کرے گی۔"

"کبوتر پالنا تو فضول خرچی ہے اور وقت کا ضیاع۔" بنی اماں کہتی تھیں۔

"وقت گزارنے کا صحیح مصرف ہے۔" وہ زور دیتی۔

"اب دیکھو کبوتر نہ ہوتے تو میرا وقت کیسے گزرتا' اکیلے پاگل ہو جاتا میں تو۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سچ تو ہے یہ اگر کبوتروں کا مشغلہ نہ ہوتا تو خالو کیا کرتے۔ اتنے موٹے آدمی کو تو بس حلوائی کی دکان ہی سجتی ہے۔

"آپ' آپ حلوائی بن جائیے۔" اس نے بیش بہا مشورہ دیا۔ خالو نے اونچا قہقہہ لگایا۔ "پھوا کے تو مزے ہو جائیں گے۔"

* * * *

دن بے حد سست گزرنے لگے۔ موسم گرم ہو گیا تھا اور لان کے سب پھول دھوپ کی تمازت سے بے رنگ ہو کر گرنے لگے تھے۔ گھر کا نظام ایسا بندھا ٹکا تھا کہ اس میں کوئی فرق ہی نہ پڑتا۔ وہ متلاشی نظروں سے جانے کیا ڈھونڈا کرتی۔ ہر جگہ کچھ سونگھا کرتی۔ مگر اسے کبھی اپنی تلاش کا منبع نہ ملا۔ وہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی۔ برتن توڑ دیتی۔ کپڑے پھاڑ دیتی' پھول نوچ کر مسل دیتی۔ کچے کچے پھل توڑ کر کاٹولا اور کھوڑے کے بچوں کو کھلاتی۔ سبزی توڑ کر پیر سوئی کی بیوی کو دے آتی۔ خالہ امی صرف اسے تنبیہی نظروں سے گھورا کرتیں۔ وہ منتظر رہتی کہ کب کس حرکت سے تنگ آکر خالہ اس سے کہیں۔

"بس۔ میں تو بھر پائی۔ یا! تم میرے گھر نہیں رہ سکتیں۔ اب تم اپنے چچا کے گھر جاؤ۔" مگر وہ زبان سے کچھ نہ کہتیں۔ وہ اور بھی جھنجلا جاتی اور خالو کی طرف رجوع کرتی۔ ان کے منھو کو پنجرے میں لکڑی کی تیلی گھسا گھسا کر ستاتی۔ وہ ناچتا پھدکتا چلاتا۔

"میں میں میاں منھو میاں منھو الحمد للہ شکریہ میاں منھو آیئے تشریف لایئے۔"

وہاں سے اٹھ کر سیاہی بلی کی دم پر پیر رکھ دیتی جو بڑی بردبار اور سنجیدہ بنی سوچ میں گم بیٹھی رہتی تھی۔ وہ غرا کر اس کی طرف لپکتی تو وہ نئے اور ننھے سے پلے کی طرف چلی جاتی۔ ایک دن اس نے نئے کتے دلبر جان کو لکڑی سے مارا۔ وہ غرانے لگا۔ غنیمت ہے کہ جھینگر وہیں تھا۔ ورنہ دلبر جان کے تیور تو خراب ہو گئے تھے۔ خالو سے یہ معلوم کر کے کہ کتے کے کاٹنے پر پیٹ میں چودہ انجکشن لگتے ہیں۔ وہ کافی خوفزدہ ہو گئی۔ مگر چند روز بعد پھر اسے بیزاری کا دورہ پڑا اور اس نے بے خیالی میں دلبر جان کو چھیڑ دیا۔ وہ غراتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ گھبراہٹ میں وہ گر گئی اور اس کی شلوار کا پائنچہ دلبر جان کے منہ میں آگیا۔ وہ بوکھلا کر چیخنے لگی۔ سب جمع ہو گئے۔ بے حد برا فروختہ ہونے کے باوجود دلبر جان نے محض ذرا سے دانت چبھوئے تھے اس کے پیر میں۔ وہ سمجھی تھی کہ وہ اسے ضرور بھیڑیے کی طرح نھنبھو ڑ دے گا۔ توفیق نے اس کے زخم میں مرچیں بھر دیں۔ زخم میں ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی۔

"تم ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہو۔" اس نے پٹی کرتے ہوئے بڑے پن سے کہا۔

"بس میرا دل۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"دیکھو' اب تم بچی نہیں ہو۔ کالج کی معزز طالبہ ہو۔ لوگ تمہیں ایسی حرکتیں کرتے دیکھ کر ہنستے ہیں۔"

"ہنسا کریں۔ مجھے پروا نہیں۔" وہ بگڑی۔

Urdu Photo.com
Mina@oneurdu.com posted by Mina@oneurdu.com

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی بچکانہ حرکتیں ایک بچی صدیوں یا عاقل لڑکی کے لیے تو ہو سکتی ہے مگر تم جیسی تعلیم یافتہ کمسن لڑکی کے لیے قطعی مناسب نہیں۔ تو خالہ امی مجھے ڈانٹتی کیوں نہیں؟ مارتی نہیں' گھر سے بھی نہیں نکالتیں۔" وہ بسور نے لگی۔

توفیق نے اسے سمجھایا۔ اپنے بچے اگر کوئی شرارت کریں تو ماں باپ انہیں گھر سے کیوں نکالیں گے۔ پیار سے سمجھا دیں گے نقصان کی نشاندہی کریں گے۔ میں اگر کوئی غلط کام کروں تو کیا امی ابا مجھے گھر سے نکال دیں گے نہیں بھئی۔ بلکہ امی ابا تو میری توجہ اس غلط کام سے ہٹانے کی تدبیر کریں گے۔ زیادہ توجہ دیں گے' زیادہ پیار کریں گے۔"

"مگر میرے امی ابا تو مر چکے ہیں۔"

"نہیں میرے امی ابا ہی تمہارے بھی امی ابا ہیں۔ اچھا تمہیں کوئی تکلیف ہو یا ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دیا کرو۔ اس طرح حماقتیں نہ کیا کرو سمجھیں۔" اس نے سختی سے کہا۔

اور زارا کے دل کو جیسے کسی نے تھپکا ہو۔ وہ اس کے بازو پر سر ٹکا کر سسکنے لگی۔

"یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہاں کی ہر چیز پر تمہارا حق ہے۔ جو چاہو کرو۔ کھاؤ پیو۔ ماموں تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں بس۔"

وہ اسے سمجھاتے رہے۔ اس کا جی چاہا کہے۔ تو پھر مجھے وہ خوشبو کہیں سے لا دیں جو میری اپنی ہے' جس میں میری جان ہے۔ میری خوشی ہے۔" وہ سنجیدہ ہو کر دل جمعی سے پڑھائی میں لگ گئی۔ اسے توفیق کی باتیں پسند آئیں۔ خصوصاً" یہ کہ وہ ایک معزز کالج کرنل ہے اسے توفیق بھی اچھا لگنے لگا۔ بڑا بھائی۔

◆ ◆ ◆ ◆

برسات نے ہر طرف جل تھل کر دیا۔ موسم بہت حسین ہو گیا اور دل بھی مسرور رہنے لگا۔

انہیں دنوں خالہ امی بہت سخت بیمار ہو گئیں۔ وہ بہت پریشان ہو گئی۔ نانی اماں تو دو تین دن کی بیماری میں ہی رخصت ہو گئی تھیں۔ اگر خالہ امی بھی۔ وہ سوچنے لگی اگر اس گھر کے لوگ بھی اسے منحوس سمجھنے لگے تو کیا ہو گا۔ آخر اس کے ماں باپ کیوں مرے۔ مرنا ہی تھا تو ان میں سے ایک تو زندہ رہتا' اے کاش خالہ امی تندرست ہو جائیں۔ وہ جی جان سے ان کی خدمت اور تیمارداری میں جٹ گئی۔ ان کے آرام' غذا' دوا کا بے حد خیال رکھتی۔ رات کو دیر تک جاگ کر ان کے ہاتھ پیر دباتی اور کتنی ہی گہری نیند میں ہوتی۔ ان کی ہلکی سی آواز سے اٹھ بیٹھتی۔ کسی طرح ان کو زندہ رکھنے کے لیے وہ دعا کے ساتھ پوری محنت کر رہی تھی۔ آخر کار وہ صحت مند ہونے لگیں تو اس کی جان میں جان آئی۔

اب وہ پھر سے کالج میں جوش و خروش سے حصہ لینے لگی۔ ایک روز وہ کالج سے گھر آئی تو خالہ امی نے اسے ایک خط دیا۔ یہ چچا ابا کا خط تھا۔ انہوں نے اپنی بیماری کا عذر کر کے زارا کو چند روز کے لیے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ خالہ امی نے خط اسے دیا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا خالہ امی اسے چچا ابا کے گھر واقعی بھیجنا چاہتی ہیں۔" ان کی طرف سے کوئی وضاحت نہ پا کر وہ جلا گئی۔

اس دن میاں بھوتی شامت آئی۔ دلبر جان کو دور سے ہی تاک تاک کر پتھر مارے جب وہ غصے میں اچھل اچھل کر بھونکنے لگا تو ڈر کے مارے وہ چھوٹی دیوار پر چڑھ گئی اور پھر اس کے پیچھے چھپ کر پتھر پھینکنے لگی۔ دلبر جان کو شامت سے بندھا نہ ہوتا تو اب تک اس کی تکہ بوٹی ہو گئی ہوتی۔ جھینگر دلبر جان کے بھونکنے کی وجہ معلوم کرنے باہر نکلا۔ تو ایک پتھر اس کی کمر میں آ کر لگا۔ اس نے ہر طرف گھوم کر دیکھا سامنے کسی کو نہ پا کر وہ ڈر گیا۔ اسی دوران پھر ایک پتھر اس کی ٹانگوں سے لگا۔ بھوت بھوت۔ وہ شور مچاتا کمرے میں جا گھسا' خالو کو یقین دلانے کی بہت کوشش کی۔ مگر انہوں نے تحقیق کے لیے بہادر کاٹولا کو بھیجا۔ دلبر جان پر برابر پتھر پھینکے جا رہے تھے کاٹولا کے جسم پر ایک چھوٹا کنکر لگا تو وہ جی داری سے آسمان یا چھت کی طرف دیکھ کر چلایا۔

"ابے باہر تو آ۔ کدھر سے چھپ کر نشانہ لگا رہا

ہے۔ بھوت کے بچے دیکھ لوں گا تجھے۔"

مگر سامنے کوئی نہ تھا اور پتھر برابر اس کے بازو' کمر اور سر پر لگ رہے تھے۔ وہ مدد کے لیے کھوڑے کو پکارنے لگا۔ کھوڑا بھی آیا اور بیر بہوٹی بھی۔ مگر کھوڑے کو ٹوٹی ہوئی دیوار کے عقب میں سفید لباس کا فرشتہ نظر آیا۔ وہ ان سب کو کھینچ کر اندر لے گیا۔

"بے بھاگ فرشتہ ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ بھوت ہوتا تو اپن پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ فرشتے تو اللہ کے سپاہی ہوتے ہیں ان سے کیا جنگ کریں۔"

وہ گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے بھیسوں کے باڑے کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ رات کو دلبر جان کو کسی نے نہیں کھولا۔ وہ بھوکا بھونکتا رہا تو توفیق نے نوکروں کی پیشی بلائی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ چونکہ ادھر فرشتوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور دلبر جان اسی علاقے میں ہے تو وہ فرشتوں کی ملکیت ٹھہرا۔ توفیق نے خود جا کر دلبر جان کو کھول دیا اور بعد میں زارا کی چوٹی پکڑی۔

"ادھر آئیے' یہ کیا حرکت تھی آپ کی۔"

"ارے واہ میں کب ایسے ہی۔" وہ سٹپٹا گئی۔ اصل ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس زارا کی ٹوٹی ہوئی چپل دیکھ کر بھید کھلا۔ وہ اسے وہیں چھوڑ آئی تھی۔ توفیق کی جرح کے جواب میں اس نے کہا۔

"خالہ امی سے پوچھئے۔ وہ مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہیں۔"

"کون کہتا ہے۔" توفیق کی سمجھ میں نہ آیا تو زارا نے خط ان کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہ کہتا ہے۔"

"تو پھر میں ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لوں گی۔ مگر اب کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔" اپنی موت کا دل گداز منظر تصور میں بھی دیکھا نہ گیا وہ رونے لگی۔

"بس آپ کا کیا بگڑے گا۔ میں جان سے جاؤں گی۔ اچھا ہے مر ہی جاؤں۔" وہ اور بھی زور زور سے رونے لگی۔

خالہ امی پر بیماری کا حملہ ہوا تو وہ باہر بھاگ گئی۔ رات کو بہت دیر کر کے کمرے میں آئی اور چپکے سے بستر پر لیٹ گئی۔ جب سے خالہ امی بیمار ہوئی تھیں وہ ان ہی کے کمرے میں سوتی تھی۔

"دوا کا انتظار کر رہی ہوں میں۔" اندھیرے میں خالہ امی کی آواز آئی۔ وہ چپ لیٹی رہی۔

"زارا! کیا تھک گئی ہو۔ دوا نہیں دو گی مجھے۔" وہ پھر بولیں۔ وہ چپکے سے اٹھی۔ میز پر رکھا ٹیبل لیمپ روشن کر کے دوا نکالی۔ گلاس میں پانی رکھا تھا۔ خالہ امی نے سر اٹھا کر دوا پی تو وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنے بستر کی طرف جاتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگی۔

"جب میں چلی جاؤں گی تو کیا میرے فرشتے آ کر دوا پلائیں گے۔"

خالہ امی مسکرائیں۔ چپ رہیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔

"اونہہ! میری بات کا جواب ہی کسی کے پاس نہیں۔" وہ چادر اوڑھتے ہوئے بڑبڑائی۔ "جیسے میں پتھر ہوں۔ کبھی ٹھوکر ماری ادھر لڑھکا دیا۔ کبھی ادھر سے ادھر پھینک دیا۔ اونہہ۔"

لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ ایک تو نیند ایسی ظالم تھی۔ چاہے اسے کتنا ہی دکھ پہنچے۔ وہ غصے میں کتنا ہی کھول رہی ہو۔ اس کے غم و غصے کی پروا کیے بغیر پلکوں پر بیٹھ کر جھولنے لگتی۔ دماغ ہنڈولا بن جاتا۔ اوپر نیچے گول گول چکر دیتا۔ سارا غم' غصہ تکلیف ایک کونے میں نیند بیگم ایک طرف فتح یاب۔ صبح وہ ناراضگی کے عالم میں ہی کالج چلی گئی۔ وہاں بھی دل نہ لگا۔

کیسا بے رنگ اور اکتایا ہوا دن تھا۔ بیزاری اور جھنجھلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ اس بے رنگ اور بے لطف سست زندگی سے تو نانی اماں کا گھر ہی بہتر تھا۔ ممانی کو ستانے میں کتنا مزا آتا تھا۔ صلواتیں سننے کو ملتی تھیں۔ علی بھیا اور شوکی کی چیزیں چھپا کر ان کی چیخ پکار سننا۔ زوبی اور بیبیں کی تنگ مزاجی اور اس کا قصور نہ ہونے پر بھی اسی کو مورد الزام ٹھہرانا اور پھر خوب تیکھے جواب دے کر ان کو تلملاتے دیکھنا۔ ارے بھئی کچھ تو شور شرابا ہو زندگی میں۔ یہاں تو کچھ بھی کر لو۔ مجال ہے کسی کی تیوری پر بل آ جائے۔

چھٹی لے کر گھر آئی۔ گھر میں گھستے ہی کچھ نئے پن

Urdu Photo.com
@oneurdu.com posted by Mina@oneurdu.com

کا احساس ہوا۔ کچھ بے ترتیبی تھی کسی کا سامان بے تکے پن سے کمرے میں پڑا تھا۔ کسی قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ ارے اس خاموش گھر میں بے وقت یہ آواز کیسی؟ بے قدموں خالہ ای کے کمرے کے دروازے سے لگ کھڑے ہوگئے۔ سامنے ہی ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ بے فکر اور لاپروا خالہ ای کی بیماری کی پروا کیے بغیر زور زور سے بول رہا تھا۔ مسلسل بولے جارہا تھا۔ تب ہی اور شامت اب ایک اور اجنبی سے ملاقات کرنا پڑے گی۔ جانے کیسے اس نے اپنی چمکتی تیز آنکھوں سے اسے دیکھ لیا اور لپک کر باہر آیا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

"میں نے چور پکڑ لیا۔ ہوتی کی ناک میں تھی یہ۔" خالہ ای پلنگ پر بے حد مسرور بیٹھی تھیں۔ انہوں نے زارا کا شرمایا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"ارے پھوڑو اسے۔ زارا میرے پاس آؤ۔"

وہ فوراً ان کے پاس جا کر ان کی آڑ میں بیٹھ گئی۔ اسے اس اجنبی سے خوف آرہا تھا جو اس قدر بے تکلفی سے اسے ٹھیٹ لایا تھا۔

"بھئی یہ زارا ہے۔ تمہاری چھوٹی بہن۔ میں نے تم کو خط میں لکھا تھا۔"

"میں؟" وہ بے چینی سے سر کھجا کر بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا ہوگی کوئی ننھی منی پریوں جیسی گڑیا۔"

"اب بڑی ہوگئی ہے اور زارا یہ ہے تمہارا نٹ کھٹ بھائی رفیق۔"

"رفیق؟ کون رفیق؟ پہلے اچانک توفیق بھائی نازل ہوئے اور اب یہ رفیق۔" خالہ ای نے بھی اسے اپنے بیٹوں کے بارے میں کہیں بتایا تھا۔ نہ خالو نے وہ سب اپنے اپنے مشغلوں میں گم رہتے یہ خوب رہی۔ یہ ایک اور بھائی اچانک بے اطلاع آ ٹپکا اور اس کے بارے میں مسلسل رائے زنی کر رہا تھا۔

"امی! یہ تو ڈرپوک چوہیا کی طرح اپنے بل میں بیٹھی آنکھیں چمکا رہی ہے۔" خالہ ای نے اسے اپنے کندھے سے چپکا لیا۔

"نہیں بھئی۔ یہ تو بہت بہادر بیٹی ہے۔ میری بیماری میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدمت کرتی رہی۔"

مجھے ابھی تو بینی کا فائدہ معلوم ہوا۔ اب میں بھی سراٹھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ لائق فائق اور حساس۔" زارا کے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

"میں یہ لایا تھا۔ اپنی ننھی منی بہن کے لیے۔" رفیق ایک پیکٹ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سادہ سا، نجل سا پیکٹ میں ٹافیوں اور چاکلیٹوں کے علاوہ دو خوب صورت سی فراکیں تھیں۔ پانچ چھ سالہ بچی کی۔ انہیں دیکھتے ہی زارا کو ہنسی آگئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ اجنبیت کی دیوار فوراً گر گئی۔ رفیق سب کے لیے تحائف لایا تھا۔ وہ ایم بی اے کے امتحان کے لیے انگلینڈ گیا تھا۔ اور وقت پر واپس آیا تھا۔ بغیر اضافے کے اس نے بے تکان بول بول کر زارا کو تھکا دیا۔ بولا دیا۔ رات کو وہ صحن میں کھڑا نوکروں کے عجیب عجیب ناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے بولا۔

"دراصل تو ان سیدھے سادے بھولے بھالے دیہاتیوں کو ناموں کی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں جس نام سے پکارا جائے۔ یہ بول پڑتے ہیں۔ اب دیکھیں یہ لڑکا جو کھڑا تھا سامنے کھڑی زارا منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے شمال میں ابا کا کمرہ ہے۔ جہاں جھینگر ہے۔ جنوب میں خانسامیوں کا باڑہ مکوڑے کا مسکن۔ مشرق میں کانولا کا کچن اور مغرب میں دلبر جان کا گھر۔ جس کے قریب پلنگ پر ــــ لیٹا ہے اب دیکھو کمال۔ میں انہیں پکارتا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو بھونپو بنا کر پکارنا شروع کیا "او زمین آسمان! ارے ٹیڑھے بڑھے! افلاطون کے سالے! چندا میاں! صبح کے تارے!"

چاروں طرف سے نوکروں کے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ "ہمیں بلایا صاحب۔ مجھے پکارا صاحب۔"

رفیق نے فخریہ انداز میں زارا کو دیکھا۔ جو منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اس کی لن ترانی سن رہی تھی۔ اور بے حد متعجب نظر آرہی تھی۔ توفیق نے اپنے کمرے سے زارا کی پریشان حالی دیکھ کر ماں سے کہا۔

"امی! یہ تو زارا کو بالکل پاگل کردے گا۔ دیکھیے تو کس قدر مضحکہ خیز صورت بنائے کھڑی ہے۔"

"وہ کب کسی سے بے تکلف ہوتی ہے۔ چھپتی پھرتی ہے۔ اب رفیق سے ہی بے تکلف ہو جائے تو اچھا ہے۔" خالہ ای نے کہا۔

دن سہانے ہو گئے تھے۔ گھر میں شور شرابا رہتا۔ رفیق بے حد بولتا تھا۔ ایسے میں پھوا بھی ان سب کے ساتھ شریک رہتی تھیں اور خالہ ای بھی۔ مگر خالو کو مصروفیات سے کم ہی فرصت ملتی۔ اب اس اپنی خوشبو کی تصدیق کرتے ہوئے زارا کے اعصاب تھک سے گئے تھے۔ ادھر رفیق کی تیز اور بلند آواز مسلسل کانوں میں گھنٹیاں بجاتی رہتی۔

"آپ ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہیں۔ تھکتے نہیں۔؟"

کبھی کبھی وہ بیزار ہو جاتی تھی۔

"ارے تم نے ابھی دیکھا کیا ہے۔ اگلے ہفتے افتی اور عزی آرہے ہیں پھر دیکھنا تماشا۔"

"یہ افتی کون ہیں۔" وہ پوچھ بیٹھی۔ "آپ کے دونوں کا صور سنائے گا کیا تھا۔"

"ہائیں میرے چھوٹے بھائی ہیں اور کون ہوتے بھئی۔ عزی ڈاکٹر ہے، افتی انجینئر دونوں امریکہ سے آرہے ہیں۔ ہم چاروں جمع ہوتے ہیں تو کسی کو ایک منٹ کی فرصت نہیں ہوتی۔"

"چار بھائی۔" وہ دم بخود رہ گئی۔ اوخدا وہ چار عدد لڑکوں کے درمیان رہے گی۔ اس نے فوراً رفیق سے کنارہ کشی اختیار کرلی وہ اسے پکارتا پھرتا۔ وہ کمرہ بند کر کے پڑھائی کرتی رہتی۔ خالہ ای صحت مند ہو گئی تھیں اور بیٹوں کے استقبال کی تیاری میں مصروف۔ وہ آئندہ کے طرز عمل کے بارے میں سوچتی رہتی۔

@ @ @ @

ایک دن رفیق نے کہا۔ "ہم کل جارہے ہیں۔ افتی اور عزی کو لینے تم چلو گی؟"

وہ بوکھلا کر خالو کی طرف دیکھنے لگی۔ "ارے نہیں۔ یہ کہاں جائے گی۔ رات کو ڈر جائے گی۔ تم ہو نہیں رہو گے۔ وہ کہاں جائے گی۔"

"چچا امی! آپ کیوں نہ ڈرامہ کھیلا جائے۔ میں انہیں کچھ نہ بتاؤں گا۔ آپ مکوڑے کی بیٹی کو زارا کے روپ میں پیش کیجیے گا۔ مزا آئے گا۔"

مگر ڈرامہ مکمل نہ ہو سکا۔ کیونکہ واپسی میں ٹرین پر زارا کے چچا زاد بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ جو زارا کو لینے آرہا تھا۔ اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں۔ وہ عزی کا دوست تھا۔ وہ اسی رات کو گھر آئے اور فوراً ہی پانچ مردانہ آوازوں اور قہقہوں سے گھر گونجنے لگا۔ ہلچل سی مچ گئی۔ نوکر ادھر سے ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ سامان اٹھایا جا رہا تھا۔ رکھا جا رہا تھا۔ سوٹ کیس کھولے جا رہے تھے۔ بلند آواز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ والان میں درسے لگی کمرے کے اندر ہونے والی اٹھا پٹخ کو دیکھتی رہی۔ ہنگامہ سا ہو رہا تھا۔ لڑکے مسلسل ادھر سے ادھر چل رہے تھے۔ پھر ایک گورے سے شربتی آنکھوں والے لڑکے نے سر اونچا کر کے کسی سے پوچھا۔

"میری کزن کہاں ہے؟"

"ارے ہاں۔ ہماری بہن کہاں ہے۔" وہ باقی دونوں چلائے۔ وہ جلدی سے خالہ امی کے کمرے میں گھس کر ان کے پلنگ پر لیٹ گئی، چادر اوڑھ کر۔ تب ہی کچھ آوازیں قریب سے آنے لگیں مگر یہ رفیق کی تھیں۔

"کمال ہے۔ میں نے کہا تھا مکوڑے کی بیٹی کو۔ آپ سے اتنا بھی نہ ہوا۔"

"چلو چھوڑو۔ مجھے خیال نہ رہا۔" یہ خالہ کی آواز تھی۔

"اور یہ شہریار صاحب کس لیے آئے ہیں؟ سارا مزا کرکرا ہو گیا۔"

"ارے وہ اپنی کزن کو لینے آیا ہے۔"

"کیا؟ میں نہیں جانے دوں گا۔ واہ ابھی تو افتی، عزی آئے ہیں۔"

"بھئی وہ بھائی والدین بیمار رہتے ہیں اس لیے زارا کو بلوایا ہے چند دن کے لیے۔ آخر ان کی بیٹی ہے وہ۔ ان کا خون، جانے دو۔ آجائے گی یہیں رہے گی وہ۔"

UrduPhoto.com

زارا کی آنکھوں میں کر پہلی بار ہو رہا تھا۔ تو خالہ امی اسے بچا کے کمرے میں رکھا کرتی رہیں گی۔ اتنے اچھے بھائیوں سے بچھڑنا اب اسے گوارا نہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بچوں کے درمیان ہونق صورت بنائے بیٹھی تھی۔ عزی اس کی تعریف میں انگلش گیت گا رہا تھا۔ افی جس کا قد لمبا تھا اور اس نے گول شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی گٹار بجا رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔ توفیق تالیاں بجا رہا تھا جبکہ رفیق ڈانس کر رہا تھا۔ صرف شہریار ان سب کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

پھر تحائف کا سلسلہ شروع ہوا۔ افی، عزی اس کے لیے بے حد قیمتی چیزیں لائے تھے۔ کئی چیزیں خالہ امی نے فرمائش کر کے زارا کے لیے منگائی تھیں۔ سونے کی گھڑی، ہیرے جڑا کنگن۔ پلاٹینم کی انگوٹھی جس میں ہیرا دمک رہا تھا۔ سنہری پرس سینڈل اور سوئیٹر۔ شال ریشمی کپڑے، فیروزے کے بندے اور نکلس۔ سب نے مل کر اس قدر اودھم مچایا کہ وہ بوکھلا گئی۔ کوئی اس کے ہاتھ میں کنگن پہنا رہا ہے تو دوسرا اس کے کانوں میں بندے ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہے کسی نے لاکٹ گلے میں ڈالا۔ انہوں نے سارے تحائف اس کے اوپر ڈال دیے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس قدر ہنگامہ تھا کہ حد نہیں صدیوں کی خاموشی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ چپکے سے آکر سو گئی۔ میٹھی نیند۔

صبح بہت جلدی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کالج کے لیے تیار ہو کر باورچی خانے میں گئی۔ کانولا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔

"کانولا! مجھے جلدی سے ناشتہ دو۔"

اس نے افی کی لائی سونے کی چین والی گھڑی پر نظر جما دی۔ اس گھڑی نے اس کی کلائی کو کیسا خوب صورت بنا دیا تھا۔ ناشتہ کر کے کچن میں آئی تو جھجک گئی۔ شہریار پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ صبح کی اجلی کرنوں میں شہریار نے اپنی اس کزن کو دیکھا جس نے افی کی امریکہ سے لائی ہوئی سنہری گھڑی ہاتھ میں پہنی ہوئی تھی۔ عزی کے لائے ہوئے سینڈل اور فیروزے کے بعد سے وہ نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ بے فکر اور شادمان اس سے ملنے اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے وہ بہت دور کا سفر کر کے آیا تھا۔ اپنے بیمار بابا کی خواہش پر۔ مگر اسے بہت مایوسی ہو رہی تھی۔ امید نہ تھی کہ وہ اس روشن اور چکا چوند زندگی کو چھوڑ کر اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گی وہ سفید لباس میں ایک معصوم بچی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر ذہانت تھی اور آنکھوں میں چمک۔ وہاں سے ہٹ کر شہریار باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کانولا سے شہریار کے لیے ناشتے کے لیے کہہ کر واپس آئی اور بولی۔

"آپ ناشتہ کر لیں۔ میں نے کانولا سے کہہ دیا ہے۔" وہ رک رک کر بول رہی تھی۔ ہائے ری اجنبیت۔

"میں سب کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "البتہ ایک پیالی چائے مل جاتی تو۔"

وہ دوڑتی ہوئی پھر باورچی خانے کی طرف گئی۔ کانولا سے چائے کا کہہ کر پھر اس کی طرف مڑی۔

"اب میں جاؤں کالج؟"

شہریار نے غور سے اسے دیکھا۔ کافی آدمیت پائی جاتی ہے اس میں۔ اس نے سوچا۔

حالانکہ وہ جب اس کی نانی کے برسے کے لیے ان کے گھر گیا تھا تو وہ یہاں آ چکی تھی۔ مگر ماموں ممانی کی زبانی اس نے زارا کے جنگلی پن۔ بے حسی ضد اور پاگل پن کے بہت سے قصے سنے تھے اور اسے اپنی اکلوتی کزن سے کوئی ہمدردی بھی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ بابا تو اس کے نام کی تسبیح پڑھنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ مگر اب اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ شاید ماحول اور توجہ نے اس کی عادتیں بدل دیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

اس نے شہریار کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ خالہ امی نے بہت پیار سے سمجھایا۔ "بھائی دلدار کے بہت منت سے تم کو بلایا ہے۔ بیٹی! وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ بیوی زندہ ہوتیں تو وہ تمہیں اپنے پاس رکھتے۔ مجبور ہیں۔ مخلص اور سچے آدمی ہیں۔ وہی تو ہمارے سب سے قریبی رشتے دار ہیں۔"

"ماموں بھی تو قریبی تھے۔"

"ان کی محبت اور شفقت کا تم کو وہیں جا کر اندازہ ہو گا۔" خالہ امی نے سمجھایا۔

بہت سی نصیحتوں اور تسلیوں کے انبار سمیٹتی وہ جہاز میں بیٹھی تو شہریار مردانہ ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ایئر ہوسٹس اسے پوچھنے آتا اور پھل وغیرہ بھی لے جاتا۔ اسے اطمینان ہوا۔ وہ کنجوس نہ تھا۔ دوسری کسی بات کا اسے قطعاً اندازہ نہ ہو سکا۔

صوبہ سرحد کے ایک قصبے میں شہریار اپنے والد کے ساتھ رہتا تھا۔ زارا کے چچا واقعی بہت بیمار تھے۔ پڑوس کے لوگ ان کی دیکھ بھال کرتے تھے اسی لیے شہریار کی واپسی کی اتنی جلدی کی تھی۔ افی، عزی کے اصرار کے باوجود وہ رکنے پر راضی نہ ہوا۔ چچا ابا نے بے قراری سے اسے اپنی گود میں بھر لیا۔ پہلی بار وہ اپنے چچا کے وجود میں سما گئی۔ جوش اور ولولے نے اسے گرفت میں لے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے اسے شدت سے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کے بالوں پر ماتھے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ مانوس سی خوشبو جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔ چچا ابا کے وجود سے وہ مانوس خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ان کے جسم میں ان کے بستر میں پورے کمرے سے ایک دل نواز، دل خوش کن خوشبو کے جھونکے اٹھ کر اس کو لپیٹ میں لے رہے تھے۔ بھولی بھٹکی ہوئی خوشبو اس کے باپ کے وجود کی مہک، کہ یہ اس کے اپنے وجود کی مہک، کہ یہ اس کو سرشار کرتی ہوئی وہ چچا ابا میں سما جانا چاہتی تھی اور ان سے لپٹ کر بیٹھی تھی، ان کا بازو تھامے وہ نمناک آنکھوں گلوگیر آواز میں سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے اس کا تعارف کرا رہے تھے۔

"زرگل آغا! دیکھو میری بیٹی آ گئی۔ میں نے بتایا تھا کہ شہریار اسے لینے گیا ہے۔ چشمہ گل آؤ۔ دیکھو میرے گھر بہار آ گئی ہے۔ میری آنکھوں میں روشنی آ گئی ہے۔ سارا گھر روشن ہو گیا ہے۔ دیکھو صنوبر جان! یہ ہے میرے گھر کی چاندنی۔"

ان کی بے ساختہ ہیجان انگیز محبت نے اسے پور پور آسودگی کی لپیٹ میں جکڑ لیا۔ اس کی ذات کا خلا جیسے خود بخود پر ہو گیا تھا۔ وہ کس قدر پراعتماد ہو گئی تھی۔ سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر جن لوگوں سے اسے ذرا بھی اجنبیت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمحے میں ان سے واقف ہو گئی۔ یہ وہ مانوس نام تھے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ تھے مگر انہیں دیکھتے ہی وہ اس ماحول، اس فضا، اس جانی بوجھی خوشبو کے واسطے سے سب کچھ پہچان گئی۔

چچا کا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ قیمتی ساز و سامان سے خالی۔ وہاں ضرورت کی اہم چیزیں تھیں۔ چچا ابا کے کمرے میں ان کے اپنے پلنگ کے علاوہ تخت بھی تھا اور میز بھی۔ الماری میں ہر قسم کی چیزیں اور برتن رکھے تھے۔ دوسرا کمرہ شہریار کا تھا وہ بھی صرف پلنگ اور دو کرسیوں کے علاوہ ایک میز سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ شہریار کافی نفاست پسند تھا۔ اس کی الماری میں بہت سلیقے سے اس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ رکھے تھے۔

اس رات وہ چچا ابا کے پاس تخت پر سوئی۔ شہریار نے ایک موٹا سا کمبل اس پر بچھا دیا اور سفید چادر بچھا دی۔ بہت رات گئے تک چچا ابا اسے اس کے والدین کے بارے میں بتاتے رہے اور وہ سنتی رہی۔ جاگتی رہی۔ نیند نے اس کی پلکوں تک آنے اور جھولنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ دماغ بھی روشن رہا اور جاگتا رہا۔ وہ اپنی ماں اور عزیز باپ کے بارے میں ایسی باتیں سنتی رہی جو آج تک کسی نے اسے نہیں بتائی تھیں۔

شفیق نرم دل اور شیریں زبان۔ اس کے باپ کی بچپن سے لے کر جوانی اور شادی کے بعد آخری زمانے کی کہانی۔ ماں کے حسن صورت کے علاوہ حسن سیرت۔ خدمت محبت اور سب کو خوش رکھنے کی کوششوں کی داستان جو دولت مند میکے سے صرف نیک سیرتی اور پاکیزہ عادات لے کر آئی تھی اور کبھی شوہر کی مفلسی، سسرال کی بے مائیگی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنی۔ خندہ پیشانی اور زندہ دلی سے محرومیوں کا

مقابلہ کرتی رہی۔ اور بھول کر بھی بیکی کی برائی کا نام نہ لیا۔ اعلا ظرف اور سیرت فاختہ والی تھے شوہر کی عزت کرتی رہی۔ ہی کم تھا جاں انہوں نے شادی کے کیا میں مرد تھا

بے اعتنائی سے باہر چلا گیا۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ چچا ابا نے بہت تعریف کی۔

"انعام کے قابل پکایا ہے کھانا میری بیٹی نے۔ بول کیا لے گی۔"

وہ بسورنے لگی "جو پہلے آپ نے مجھے چیزیں بھیجی تھیں۔ وہی کب ملیں۔"

چچا ابا شہریار سے پرسش کرنے لگے، شہریار نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر پہلے زارا کو پھر باپ کو دیکھا پھر اس نے سادگی سے کہا۔ "کیا کرتا دے کر۔ مذاق اڑوانا ہے تو کہیے۔ ابھی دے دوں؟" وہ پھر کھانا کھانے لگا۔

"مذاق کون اڑائے گا؟" چچا ابا کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

"جہاں تحفے میں سونے کی گھڑی، ہیرے کے کنگن اور پلاٹینم کی انگوٹھی ملے۔ وہاں آپ کے بھیجے چاندی کے چھلے اور چھوٹے بچوں کے زیور کی کون قدر کرے گا۔ اسی لیے وہ سب میں نے وہیں اسٹیشن پر پھینک دیے۔"

زارا کا جسم ایک دم سن ہو گیا سارا خون اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ منہ تک لقمہ لے جانا محال ہو گیا۔ شہریار کھانا ختم کر کے بے نیازی سے باہر چلا گیا۔ چچا ابا بھی رنجیدہ ہو گئے پھر بولے۔

"تحفہ تحفہ ہوتا ہے۔ سونے ہیرے کا ہو کہ پیتل کا اور پھر پورا مہینہ اوور ٹائم کر کے محنت مشقت کر کے جو چیز لی جائے۔ وہ حقیر تو نہیں ہوتی۔ اس میں تو انسان کا خلوص، محبت اور پسند شامل ہوتا ہے اس سے قیمتی تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آج کل کے لڑکے ذرا ذرا سی بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔"

زارا کا دل بھرا آ رہا تھا۔ اسے رونا آنے لگا۔ کیسا جنگلی انسان ہے یہ۔ محنت کی کمائی کوئی یوں پھینکتا ہے بھلا اور اسے بتایا تک نہیں۔ وہ اتنی بد اخلاق تو نہیں تھی۔

دن بھر شہریار باہر رہا اور رات کو آیا بھی تو کھانا کھا کر وہ سارا دن کھولتی رہی۔ چچا ابا کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ پرانی تصویروں کا البم کھول کر بیٹھ گئے، اس سے وقت کچھ اچھا گزرتا ماں باپ کی تصویریں اس نے بغور دیکھیں اور اچانک ایک عورت کی تصویر دیکھ کر اسے شبہ سا ہوا۔ جیسے یہ تصویر اس کی دیکھی ہوئی ہے۔ مگر نہیں۔ اس نے تصویر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بلکہ وہ خود اس تصویر جیسی تھی۔ یہ اس کی ماں کی تصویر تھی۔ چچا ابا نے اس کے شبے کی تصدیق کی۔

"اور یہ ابا کی تصویر نہیں بلکہ شہریار بھائی کی لگ رہی ہے۔" زارا نے ایک تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔ چچا ابا مسکرائے۔ "ہاں سب کہتے ہیں شہریار بالکل اپنے چچا کی شبیہہ ہے۔"

زارا تصویریں دیکھ کر تھک گئی تھی مگر خوش تھی۔ چچا ابا بستر پر لیٹ گئے تو وہ رات کو باہر آ گئی۔ صحن میں چھٹکی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ شہریار کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی؟"

"چاندنی دیکھنے آ گئی۔"

"کیوں کبھی دیکھی نہیں؟ تمہارے وہ چار بھائیوں والے محل نما گھر میں کیا اندھیرا رہتا ہے؟"

"اندھیرا کیوں ہوتا۔ مگر چھوٹے سے صحن میں یہ چاندنی زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔ گھر بھر گیا ہے اجالے سے۔"

"یہ اجالا چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات غریبوں کی دنیا میں بس اتنی ہی روشنی ہوتی ہے اور پھر اندھیرا دکھوں کا۔ فکروں کا۔" وہ تلخی سے بول رہا تھا۔

"چچا ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس نے تسلی دینا چاہی۔ اس نے زارا کو بغور دیکھا۔ سمجھدار معلوم ہوتی ہے۔

"کیسے ٹھیک ہوں گے۔ ان کا مناسب علاج بھی نہیں ہو رہا اور تنہائی، بے آرامی اور میرے مستقبل کی فکروں نے ان کو بالکل بے سکت کر دیا ہے۔ ڈاکٹر روز یہاں آ تے نہیں اور وہ شہر جانے پر تیار نہیں افوہ۔"

وہ سر پر ہاتھ رکھ کر مڑ گیا۔ "تمہیں بھلا یہاں کے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں بھی کتنا نادان

Urdu Photo.com

ہوں۔ تمہیں لطیفوں اور خوب صورت باتوں کے بجائے میں پریشان کن تذکرے لے بیٹھا۔ چاہتا ہوں۔ تمہاری اور پریشانی ہی میرا مقدر ہے۔"

"خدا نہ کرے۔ آپ شادی کرلیں۔ چچا ابا بھی تنہا نہ رہیں گے اور آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔"

"سبحان اللہ۔" وہ قہقہہ اڑانے کے انداز میں بولا۔ "اگر شادی پریشانی کا حل ہوتی تو شادی شدہ انسان سب سے زیادہ مزے میں ہوتے۔ خیر تم اب واپسی کی تیاری کرلو۔ میں اگلے ہفتے تمہیں واپس لے جاؤں گا۔" وہ موضوع بدل کر اچانک اس کی واپسی کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ وہ حیران ہوگئی۔

"کیوں؟ میں تو واپس نہیں جاؤں گی۔"

"بابا سے مل تو لی ہو۔ مقصد ملاقات ہی تو تھا۔ اب جاؤ واپس، وہ سب منتظر ہوں گے۔"

"آپ میرے کوئی نہیں؟ اور چچا ابا میرے کوئی نہیں؟ یہ گھر کیا میرا نہیں؟"

"خوش فہمی کی میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔" اس نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ "میں تم سے پہلی بار ملا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ میرا تم سے خونی تعلق ہے۔ رشتوں پر میں یقین نہیں رکھتا۔"

چاندنی کے شعلے برسنے لگے۔ تحقیر کے احساس نے زارا کو گرم شعلوں میں نہلا کر رکھ دیا۔ وہ تڑپ گئی۔ یہ مالوس گھر۔ اس گھر کی وہ معطر ہوا اور اس کے ماں باپ کے قدموں کی آہٹیں۔ ان کی وہ خوشبو جو گھر کے ذرہ ذرہ میں بسی ہوئی ہے۔ کیا سب جھوٹ ہے۔ کیا خونی تعلق کا وہ سرا نام رشتہ نہیں، پھر اس ماحول میں اجنبیت کیوں نہیں غیریت کیوں نہیں؟ وہ کمرے کے دروازے میں جو گھٹ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ آنسوؤں کے گولے کو نگلتے ہوئے چلا کر بولی۔

"اگر میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ تم پہلی بار مجھ سے ملے ہو تو اس میں میرا کیا قصور؟ تم نے کبھی مجھے بلایا؟ مجھ سے ملنے آئے؟ کبھی مجھے اپنا سمجھا؟ بولو۔"

روتے روتے وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز سن کر چچا ابا بھی کمرے سے نکل آئے تھے اور دیوار تھام کر دھیرے دھیرے اس کے پاس آکر کھڑے ہوگئے اور شہریار کو گھورنے لگے جو خود ہی پریشان اور پشیمان نظر آرہا تھا۔ چچا ابا کو قریب پاکر وہ اور بھی پھیل گئی۔

"چچا ابا! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ خالہ امی کے پاس بھی نہیں۔ مجھے اب کسی کا سہارا چاہیے نہ ہمدردی۔ اب آپ ہی میرے سب کچھ ہیں۔"

وہ بجلی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے روتی آواز میں جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔ آپ کی خدمت کروں گی۔ کھانا پکاؤں گی۔ میں اب تھک گئی ہوں ادھر سے ادھر بھاگتے بھاگتے پیر شل ہوگئے ہیں میرے۔ مجھے کچھ آرام کرنے دیجیے اپنے پاس۔"

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ چاندنی ڈھل گئی۔ چچا ابا اسے سہلاتے پچکارتے رہے۔ مگر جب تک اس نے اقرار نہ کروالیا۔ تخت پر لیٹی نہیں۔ زمین پر بیٹھی رہی۔ وہ اسے بستر پر لٹا کر اپنے پلنگ تک پہنچے تھے کہ وہ سو بھی گئی۔ اگلے دن وہ گنگناتی گاتی رہی اور گھماتا پھراتا رہا۔ دوسرے خالہ امی کا خط آیا چچا ابا کے نام

"لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے۔ محض اتفاق اور زارا کی خوش قسمتی سے ایک بہت اچھا رشتہ آگیا ہے۔ لڑکا انجینئر ہے۔ مالی پوزیشن بھی مستحکم ہے۔ سوچتی ہوں اس کا فرض ادا ہو جائے تو میں کسی قدر ہلکی پھلکی ہو جاؤں گی۔ میرے چاروں بیٹے تو ابھی سے اس کے جہیز کا سامان اکٹھا کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ ابھی تو منگنی کروں گی۔ شادی اگلے سال ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کی اسے ہمیشہ ضرورت ہوگی، شادی اور منگنی پر آپ کی موجودگی لازمی ہے۔ اب اسے بھیج دیجیے۔"

چچا ابا فکرمند ہوگئے۔ رات کو شہریار آیا۔ خط پڑھ کر سنایا گیا۔ باپ کو دیکھ کر چپ ہی رہا۔

"وہ جانا نہیں چاہتی۔ زبردستی کرنے کو میرا دل گوارا نہیں کرتا۔" چچا ابا نے آہستہ سے کہا۔

"بابا! جانا تو ہے اسے۔ سمجھا دیجیے۔ مان جائے گی۔"

"نہیں مانے گی۔ سنو شہریار! میں سوچ رہی ہوں کیوں نہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ دولت بھی ہے۔ اس کے چہرے پر یتیمی، بے بسی ابھی تک جوں کی توں موجود ہے۔ تم تم سے شادی ہو جائے تو وہ یہاں رہ سکتی ہے۔"

شہریار اچھل پڑا۔ "بابا! کیا کہہ رہے ہیں۔ وعدہ کتنی ان لوگوں سے جو اسے اپنی سگی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ آپ اس گھر کی محرومیوں کا اسے تو حصہ دار نہ بنائیں۔ وہ وہاں بہت خوش تھی۔ یہاں۔۔۔ یہاں کیا ہے اور میں ایسی ادھوری لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی تباہ نہیں کروں گا۔ یاد رکھیے گا۔ ایک پرائی لڑکی ہی اس گھر کے دکھ بٹا سکے گی۔ جو قوت فیصلہ رکھتی ہو۔ کمزور کردار کی۔"

زارا سے اس نے کہا۔ "چلو کزن! تیاری کرلو۔ کل چھٹی کی درخواست دے رہا ہوں۔"

"میں تو نہیں جارہی۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "چچا ابا نے وعدہ کیا ہے۔"

"ادھر تمہارے چار عدد بھائی تمہارا جہیز اکٹھا کر رہے ہیں اور تم اسے دیکھنے کا بھی شوق نہیں تم کو دیکھنے کا ہیں اور تم امریکہ سے آئی ہو۔ اگلے ہفتے ختم ہونے سے پہلے اس نے انگوٹھی، کنگن، ہار اتار کر اس کے قدموں میں پھینک دی اور ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی اور پیلی پڑ کر کا حلوہ بھوننے لگی۔ ساتھ ہی بہتے ہوئے آنسو آستین سے پونچھتی جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ زیور لیے آگیا۔

"اپنا زیور ادھر ادھر کوئی چیز رہ گئی تو تمہیں بھوگی۔"

"جو لے میں رکھ دوں گی سب چیزیں۔" کہہ کر اس طرف لپکی۔

شہریار نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔ "وہ غضب ہو جائے گا۔ ں کا مال ہے۔"

حلوہ کھاتے ہوئے چچا ابا بے حد خوش تھے۔ "بھئی ں ہے ماں کو دیکھا نہیں مگر مزہ سارا اسی کے جیسا ہاتھ میں لطف آگیا۔"

"ہاں، نمک کی مقدار بھی مناسب ہے۔" شہریار نے پھر شوشا چھوڑا۔ "آنسوؤں میں شیرہ تیار کیا گیا تھا۔"

"چچا ابا نے مجھے بتایا تھا، جب میری ماں کو کسی پر غصہ آتا یا کوئی دکھ پہنچتا۔ وہ فوراً سوجی کا حلوہ بنا لیتیں اور سب کو کھلاتی تھیں، غصہ اتر جاتا تھا۔ ہیں نا چچا ابا؟"

اس نے چچا ابا کی گواہی چاہی۔ انہوں نے اس کے سر پر پیار سے چپکی دی۔

"تم سن رہی تھیں حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ تم سو گئی ہو تم نے کچھ سنا نہیں۔"

"ایک ایک بات یاد ہے۔ سب باتیں سن لی تھیں میں نے اپنے امی ابا کی باتیں کیسے بھول سکتی ہوں۔"

"اور وہ جو آپ کی خالہ امی نے کہا تھا اور لکھا ہے وہ بھی یاد ہے واپسی کی بات۔"

"بھول گئی۔" اس نے بے ساختہ کہا اور منہ پھیر کر جلدی جلدی حلوہ کھانے لگی۔

وہ چمچہ پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔ "تو ٹھیک ہے جب چاروں بھائی لینے آئیں گے تب ہی جانا۔ میں غلام تو نہیں ہوں کسی کا۔ تین دن کی چھٹی پہلے لے چکا ہوں۔ تین دن کی اب درخواست دی تھی۔ منظور ہوگئی بلا تنخواہ۔"

وہ پیر پٹختا باہر چلا گیا۔

"ابھی کہہ رہے تھے چھٹی کی درخواست دے رہا ہوں۔ اب کہہ رہے ہیں منظور ہوگئی۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کس طرح منظور ہوگئی؟" وہ حیرانی سے چچا ابا کو دیکھنے لگی۔ جو چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ ڈر گئی۔ کہیں چچا ابا ہی کمزور نہ ہو جائیں۔ اسے جانا ہی نہ پڑے کہیں۔ کتنا ضدی شخص ہے یہ اپنے باپ کی بات بھی نہیں مانتا۔ ان کی بیماری کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ بے چارے کس قدر کمزور ہوگئے ہیں۔ مگر میں ان کی خدمت کروں گی۔ خوب دیکھ بھال کروں گی۔ خالہ امی بھی تو صحت یاب ہوگئی تھیں۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔

اس نے چچا ابا کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ ان کا کمرہ صاف کیا۔ بستر بدلا۔ ہر پیر اداس کر

UrduPhoto.com
Mina@oneurdu.com posted by Mina@oneurdu.com

دھوپ میں ڈالا پھر صنوبر جان اور آغا زرگل کے مشورے سے مرغ کے جوڑے کی یخنی تیار کی۔ چشمہ گل سے کہہ کر میر زماں کے باغ سے پھل منگوائے دن میں کئی دفعہ پھولوں کا جوس اور یخنی انہیں پلائی۔ چچا ابا کو سچ مچ ایسی ہی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ دو دن میں ہی ان کے چہرے کی زردی کم ہو گئی۔ ہاتھ پیروں میں طاقت آگئی۔ آغا زرگل بے حد حیران اور خوش ہوئے۔ تمام ملنے والے جو کئی دن کے بعد آئے ان میں نمایاں فرق کا اظہار کرتے پوچھتے۔ "کس ڈاکٹر کا علاج کیا تھا؟"

جواب میں چچا ابا زارا کی طرف اشارا کر کے فخر سے مسکراتے۔ زارا کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ اس کی مصوفیت بے حد بڑھ گئی تھی دن بھر وہ جوس نکالنے میں ہی مصوف رہتی۔ اب چچا ابا کو کھانے کے بجائے یخنی اور جوس ہی دیا جاتا اور وہ صنوبر جان اور پری گل کے ساتھ اپنے ان مہربانوں کے گھر بھی چلی جاتی جو اس سے ملنے بار بار آتے تھے۔

وہ بہت خوش تھی۔ خوشیاں جیسے اسے تحفے میں ملی تھیں۔ اس پورے علاقے میں سب کے گھروں میں وہ دل خوش کن خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جس کی تلاش میں وہ برسوں تڑپی اور بے قرار رہی تھی۔ یہاں آکر اس کی روح کو آسودگی نصیب ہوئی تھی جو خالہ امی کے محل نما گھر میں بھی نہ تھی اور نانی اماں کی پر محبت آغوش میں بھی نہیں۔ سادہ اور خالص پانی اور صحت افزا ہوا نے اس کی صحت پندرہ دن میں ہی کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ رخسار سیب کی مانند سرخ ہو گئے اور آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ کئی دن بعد چھٹی کے دن شہریار نے اسے دن کے اجالے میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا؟" وہ سٹپٹا کر اتنا ہی کہہ سکا۔ پھر کھانے پر نظر ڈال کر جلدی سے بولا۔ "روزانہ مرغی پکا پکا کر کیا تم میرا دیوالیہ نکالنا چاہتی ہو؟"

"نہ۔۔۔" وہ اس کے اعتراض سے ڈر گئی۔ "مرغی تو بہت سستی ملتی ہے۔ اس میں یخنی بھی بن جاتی ہے اور دو وقت کا سالن بھی کیا اچھا نہیں ہے۔"

وہ اپنی کفایت شعاری کے مزید جھنڈے گاڑنا چاہتی تھی مگر اس کے تیور ٹھیک نہیں، تھے ہمت نہ پڑی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ میرا مطلب تھا کہ جب تم چلی جاؤ گی تو کون یہ سب کرے گا۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔

"مگر میں کیوں چلی جاؤں گی؟" وہ جلدی سے بوکھلا بھول پن سے بولی۔ شہریار کو غصہ آنے لگا۔

"شادی ہو جائے گی تمہاری۔" وہ جھلا کر بولا۔

"تب تو دفع ہو گی۔ یا نہیں۔ بہتر یہی ہے محترمہ کہ آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں اپنا عادی نہ بنائیں میں اپنا سارا کام خود ہی کر لیا کروں گا۔ کھانا بھی جیسا آتا ہے پکا ہی لوں گا۔"

"مگر میری موجودگی میں میں ہی کروں گی سب کچھ دیکھ لیں۔ چچا ابا کو اب دوا کی بھی ضرورت نہیں رہی۔" وہ بڑھ بڑھ کر بولنے لگی تو شہریار کو پھر غصہ آ گیا۔

"نہیں اس قدر خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں زیادہ تو خرچ نہیں کرتی۔" وہ سہم گئی۔

"ہاں۔ اس بارہ کنال کے محل سے آگر تو تمہیں یہاں کا خرچ نظر ہی نہیں آتا ہو گا۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری تنخواہ اتنی ہے جتنی کہ تم کسی بھکاری کو خیرات دیتی ہو گی۔ میں غریب آدمی ہوں چادر سے پیر نکالنے کی ہمت نہیں کرتا۔ جب سے تم آئی ہو پیر سمیٹ سمیٹ کر میں تھک گیا ہوں۔"

"میری وجہ سے آپ لوگوں کو بہت دکھ پہنچا ہے۔" آنسوؤں نے یلغار کی تو وہ کچھ بول نہ سکی۔

"دکھ۔" وہ ہنسا۔ اسے زارا کے آنسوؤں کی بھی خاص پروا نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کمزور لڑکیاں اسی طرح رو دیتی ہیں حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ان میں۔

"دکھ ارے تم تو بے ضرر چڑیا کی مانند محض ٹھونگ ہی لگا پائی ہو۔ پگلی! میں نے تو اتنے دکھ سہے ہیں۔ اس قدر اذیتیں برداشت کی ہیں کہ بڑے سے بڑا زخم بھی تکلیف نہیں پہنچاتا۔"

وہ بے خیالی میں بولنے لگا۔ سامنے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں غنودہ سی ہو گئیں۔ "ماں سے محرومی کا دکھ، تنہائی کی اذیت، غربت کے بے شمار تیر اور کڑوے لوگوں کے ہزاروں نشتر، میرا دل تو چھلنی ہو چکا ہے اب میں چھوٹی موٹی تکلیف کی پروا نہیں کرتا۔" وہ ہنسا "اور اب تو میں اپنی زندگی کے فیصلے بھی کر سکتا ہوں۔ عمل کی قوت بھی ہے اور معقول کا ذریعہ بھی۔"

"اور آپ کے پاس چچا ابا بھی ہیں۔ میرے پاس وہ بھی نہیں۔" وہ بولی تو شہریار نے چونک کر اپنی واحد رشتہ دار کو دیکھا۔

"اور عقل بھی نہیں۔ صرف بارہ کنال کے مکان کی ملکیت کا احساس اور فخر ہے اور وہ کافی ہے۔"

"مگر وہ تو میرا گھر نہیں۔ میرا گھر تو یہ ہے جہاں میں رہ رہی ہوں۔ میرے ابا کا گھر، دادا کا گھر۔"

معصومیت سے منہ اٹھائے شہریار کو دیکھ رہی تھی شہریار کے دل کو ایک نئی کیفیت سے دوچار کر گئی۔

"اس گھر میں تمہیں سوائے دکھوں کے اور کیا ملے گا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "اور میں اپنی اذیتوں میں تمہیں حصہ دار نہیں بنا سکتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری خالہ تمہاری خوشیوں کے لیے کوئی طریقے پر سوچتی ہیں۔ ہم اس قابل بھی نہیں کہ تمہیں زبانی وعدوں سے ہی خوش کر سکیں۔"

"مگر میں آپ سے کچھ مانگوں گی ہی نہیں۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے بتا بھی نہ سکی کہ اس گھر میں اس کی زندگی موجود ہے۔ اس کا مستقبل چھپا ہوا تھا۔ جو تلاش بسیار کے بعد اب ملا ہے تو کس بے دردی سے کام لے رہا ہے وہ اسے کیسے بتائے کہ اس کے دکھ میں اس کی سب سے بڑی خوشی کا انحصار ہے۔ وہ دکھ جو اس کی ماں نے سہے اور اپنا نام زندہ کر گئی۔

"میرا خیال ہے اب چلیں۔ دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے۔" اس نے زارا کو سہارا دیا۔

اس موقع پر چچا ابا اس کی حمایت کو موجود تھے۔ انہوں نے کہا "میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اس کی

Urdu Photo.com

مرضی کے خلاف کبھی نہیں بھیجوں گا۔"

"وہاں سے خط آیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں وہ مجھے دھوکے باز فریبی کے الفاظ سے یاد کریں۔ میرا وعدہ دو ہفتے کا تھا۔ اور پاپا! میں جھوٹا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔"

"دو ہفتے سے زیادہ تو ہو ہی گئے ہیں۔" چچا ابا نے رسان سے کہا "اور میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اپنی بچی اپنے پاس رہے۔ اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ خود بھی چاہتی ہے۔ میں نے تو اسے ورغلایا نہیں۔"

"پاپا کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ عاجز آکر تلخی پر اتر آیا۔

"حقیقت کی دنیا میں آیئے وہاں ایک روشن صبح اس کی منتظر ہے۔ آپ اسے رات کی تاریکی دینا چاہتے ہیں۔ یہ دشمنی ہے اس کے ساتھ۔"

"مگر میں نے اس سے عہد کیا تھا۔"

"آپ اپنے وعدے اور عہد کے لیے کفارہ دے دیجیے۔ میں اس کی واپسی کا ذمہ دار ہوں۔"

وہ شور مچانے لگی۔ "میری واپسی کا ذمہ تم نے کیوں لیا؟ کیا تم میرے مالک و مختار ہو؟"

"زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔" وہ سرد آواز میں بولا۔ "چلو۔"

وہ دھم سے زمین پر گر گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ "ادھر اور ادھر پھرتے پھرتے میں تنگ آگئی ہوں۔ ایک جگہ آرام بھی نہیں کرنے دیتے۔ کتنے سنگ دل ہو۔ تمہیں مجھ پر ترس بھی نہیں آتا ہائے میری ماں مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی۔"

"اچھا اب چپ ہو جاؤ۔" وہ سختی سے بولا۔ مگر کچھ نروس ہو گیا تھا۔

"کیسے چپ ہو جاؤں؟" وہ درد بھرے لہجے میں سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ "یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں۔ لڑھکتے لڑھکتے میری ساری جان لہولہان ہو چکی ہے۔ میری روح زخمی ہو گئی ہے۔" پھر ایک دم چیخ کر بولی۔ "تم کو میرا بہا ہوا خون نظر نہیں آتا۔ تو میں کیا کروں۔ میرا اس میں کیا قصور ہے؟ بتاؤ میرا کیا قصور ہے۔"

اس کا بلبلانا چچا ابا سے دیکھا نہ گیا۔ انہوں نے اسے گود میں سمیٹ لیا۔ راحت جان خوشبو کے بھبکے اس کی ناک سے ٹکرائے تو وہ پر سکون ہو گئی۔ شفقت اور پدرانہ محبت کی مطر ہواؤں نے اسے اپنے احاطے میں اسیر کر لیا۔ شہریار اندر سے اس کا سوٹ کیس اٹھا لایا۔

"چلو گاڑی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" وہ تو یوں بے نیاز تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہو نہ سنا ہو۔

زارا تڑپ کر چچا ابا کو دیکھنے لگی۔ وہ بیٹے کی سنگ دلی پر جز بز تھے اور بے بس۔

آہستہ سے وہ ان کی گود سے اٹھ گئی۔ ہتھیلی سے رخسار رگڑے۔ دوپٹے سے آنسو خشک کیے۔ کھڑے ہو کر مضبوطی سے بولی۔

"اچھا چچا! ابا خدا حافظ۔" اور گھر سے باہر آگئی۔

شہریار سوٹ کیس اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

اسٹیشن کافی دور تھا۔ تانگہ دھیمی چال چل رہا تھا۔ گھوڑا مریل سا تھا۔ شہریار خاموش تھا۔ زارا کسی طرح اسٹیشن آیا تو وہ کود کر نیچے اتری۔ تانگے والا گھوڑے کو تھپکنے سہلانے میں لگا ہوا تھا۔ اچانک اس نے مڑ کر شہریار کو دیکھا اور کہا۔

"وہاں تو وہ لوگ میرا جہیز بنا رہے ہیں۔ تم مجھے کیا دو گے؟"

شہریار بوکھلا گیا۔ اچانک حملہ اور وہ بھی قطعاً غیر متوقع۔

"میں۔"

"کیوں؟ میں تمہاری اکیلی چچا زاد بہن ہوں۔ میرے رشتے کے خالہ زاد بھائی تو ہیرے جواہرات دیں گے۔ قیمتی سامان کا انبار اکٹھا کر رہے ہیں۔ تم تو میرے دادا کے تنہا نام لیوا ہو۔ کیا مجھے دادا کی اولاد سے کچھ نہیں ملے گا؟"

"ہم۔ ہم میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے دینے کے لیے۔" وہ ہکلانے لگا۔

"تو تمہیں شرم بھی نہیں آئے گی۔ پہلے بھی کبھی میری خیر خبر لی۔ ملنے آئے۔ خط تک نہ لکھا۔ میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گئی۔ اب کیا سب کے سامنے مجھے ذلیل کرو گے۔"

"مگر وہاں تو کوئی کمی نہ ہو گی۔ پھر میرے تحفے کی تم کو کیا ضرورت۔"

مال گاڑی ابھی لائن پر کھڑی تھی اور ٹکٹ کی کھڑکی بھی بند تھی وہ وقت سے بہت پہلے آگئے تھے۔

"تحفہ ضرورت کے تحت تو نہیں دیا جاتا اور شاید مجھے تمہارے تحفے کی ضرورت ہی ہو۔ مگر تحفہ ایسا ہو کہ اپنے منہ بولے ان بھائیوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔" شہریار کچھ جز بز سا تھا۔

وہ پھر بولی۔ "پہلے مجھے ان دولت مندوں کے سپرد کر دو۔ تو اب مقابلہ تو کرنا ہو گا۔ یا اپنی شکست مان لو۔ اگر ہار مان لو تو میں معاف کر دوں گی۔"

"میرے پاس میری زندگی بھر کی کمائی میرا غرور ہے زارا۔" وہ اشتعال میں آگیا۔

"جنگ میں ہار جیت ہوتی ہے۔ میں لڑ کر تو فتح یاب بھی ہو سکتا ہوں اور ہار بھی سکتا ہوں مگر ہار مان لینا تو خود کو ذلیل کرنا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔" وہ تنک کر بولی۔ "یا تو کوئی چیز ہی نہ رکھا ہوتا۔ ملتے ہی نہیں۔ مجھے لاتے ہی نہیں۔" شہریار ٹھوکر سے پتھر اڑا رہا تھا۔ قدرے مطمئن تھا۔ مال گاڑی سرکنے لگی تھی۔

"فکر نہ کرو۔ میں اپنا مکان تمہیں دے دوں گا کہ واحد وہی دولت میرے پاس ہے۔"

"مکان؟ دے دو گے؟" وہ چنک کر بولی۔ شہریار جوش میں کہا۔ یہ معلوم ہو گیا۔

"ہاں دے دوں گا۔"

"وعدہ کرو۔"

"وعدہ۔"

"اس قدر مری ہوئی آواز سے کیا وعدہ بھلا کب وفا ہو گا۔" وہ قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔

وہ بپھر گیا "جب کہہ دیا وعدہ تو وہ پتھر کی لکیر ہو گیا۔ میں وعدہ نبھانا خوب جانتا ہوں۔"

"یاد رکھو گے نا۔" وہ پر شوق انداز میں کہہ رہی تھی۔

"دل پر لکھا ہے۔ جب چاہو آزما لو۔"

"تو پھر۔" وہ ہونٹ دبا کر شرارت سے مسکرائی۔

"ابھی اسی وقت۔"

"کیا؟ کیا؟"

"ہاں اب کون انتظار کرے۔ پہلے خالہ امی کے گھر جاؤں پھر شادی کروں پھر تم سے مکان لوں۔ اتنا لمبا انتظار فضول۔"

اس نے ہاتھ ہلا کر تانگے والے کو پاس بلایا۔ پھر شہریار کا ہاتھ پکڑ کر اچک کر تانگے میں بیٹھ گئی۔ وہ سوٹ کیس اٹھائے ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"اتنی سی بات کے لیے میں اپنا گھر تو چھوڑ کر نہیں جا سکتی اور مجھے تمہاری عزت اور غیرت بھی عزیز ہے۔" وہ بولے جا رہی تھی۔

"وہ میرے دور کے رشتے دار تو ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگا دیں اور تم صرف ایک چھوٹا سا مکان دو۔ مجھے ان ہیروں سے کوئی دلچسپی نہیں جو زیور میں لگے ہوں۔ البتہ مکان میری ضرورت ہے۔ میرا اپنا گھر ہیرے جڑا۔"

شہریار ایک نئی زارا کو دیکھ رہا تھا۔ جو فیصلہ کر سکتی تھی۔ حالات کا رخ موڑ سکتی تھی۔ عقل اور ہمت کی مالک، پر اعتماد تھی۔ اسے تو اپنی یہ من موہنی سی بھولی بھالی کزن پہلے بھی پسند تھی لیکن وہ اس کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتا تھا، ذہین حوصلہ مند اس کے فیصلے نے اسے مطمئن کر دیا۔ کہ جو فیصلے اپنی مرضی سے خود اپنے آپ کیے جائیں۔ وہ خوش دلی سے نبھائے جاتے ہیں۔

جب تانگہ گاؤں کی سمت مڑا۔ ٹرین سیٹی دیتی ہوئی اب اسٹیشن کی جانب آرہی تھی۔

مٹی کی خوشبو نے زارا کے وجود کو سرشار کر دیا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی۔ پر سکون مدہوش کن۔

Urdufanfiction.com